اقبال
اور
مغربی استعمار
مصنف : محمد گلزار راحت

ابراہیم جان

NP6/12

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از

محمد گلزار راحت

لیکچرار

گورنمنٹ ترقی تعلیم کالج خانپور ضلع رحیم یار خان

مصنف .... محمد گلزار راحت

ایم اے جرنلزم ۔ ایم اے پولٹیکل سائنس

پبلشر ..... محمد یونس طور

پرنٹر ...... تاجدین پریس

تعداد...... ایک ہزار

قیمت .... [illegible] روپے

مکتبہ طور

آبکاری روڈ

انارکلی ۔ لاہور

فہرست

حصہ اوّل

حصہ دوم

انتساب

اس ماموں کے نام جو نہ صرف نام کے رفیق ہیں
بلکہ حتی المقدور حقوق العباد پہچاننے کی کاوش
میں رفیقِ اعزا و رفیقِ سنسار ثابت ہوئے۔

پیش لفظ

فکرِ اقبال ایسا اتھاہ سمندر ہے کہ جس میں سے گوہر مقصود کی تلاش میں بیشمار علماء و فضلاء نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں لیکن ان کے علم کی پیاس نہ بجھ سکی۔ اس ناچیز نے بھی ان گہرے افکار سے کچھ ڈھونڈنے کی سعی کی لیکن کچھ پانے کی تمنا مزید بڑھ گئی۔ بہر حال یہ شوق و جستجو کی اڑان تھی کہ شب و روز کی عرق ریزی سے بندہ علم کے چند انمول موتی چُن پایا۔

زیرِ نظر کتاب میں مغربی استعمار کے خلاف اقبال کی تہذیبی و سیاسی جدوجہد کا احاطہ کرنے کے مقصد سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے حصہ اول ان کی تہذیبی اور حصہ دوم سیاسی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اس بات کی حتیٰ الوسعی کوشش کی گئی کہ مشکل یا عربی و فارسی اشعار اور الفاظ سے احتراز کیا جائے مگر کیونکہ علامہ کی شاعری کا کثیر حصہ فارسی زبان پر مشتمل ہے چنانچہ حوالاجات خصوصاً سیاسی امور و مسائل کی وضاحت کے لئے مختصراً ان کے فارسی کلام کا انتخاب کرنا پڑا۔

اکثر مصنفین، مضامین نگار اور محققین نے اقبال کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے جبکہ راقم الحروف نے انتہائی کوشش کی کہ اقبال کی سوچ اور اس کی جدوجہد کو اس کی اصل روح کے ساتھ پیش کیا جائے چنانچہ انہوں نے جہاں بھی کسی ایک نظریئے یا فلسفے سے اتفاق یا اختلاف کیا میں نے

اسے اسی رنگ میں ویسے ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عموماً وہ اسلامی نظام حکومت و سیاست کے داعی رہے۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ جمہوریت پر تنقید کے باوجود انہوں نے پنجاب کی مجلس مقننہ میں نمائندگی کے لئے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور اس بات کا اعلان کیا کہ "ذاتی طور پر میں اس ڈیموکریسی کا معتقد نہیں ہوں بلکہ اسی لئے اسے گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں"۔ بعد ازاں مسولینی اور ہٹلر کی فسطائی تحریکوں کی بھرپور حمایت کی اس کی جو ممکنہ وجوہات تھیں۔ ان کا سرسری سا تذکرہ بھی اس کتاب میں ہے اور جب اسی فسطائیت نے سامراجی راہیں اپنانا چاہیں تو انہوں نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے۔

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ۔ روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسا یہ حقیقت ہے دل خراش

بعض مواقع پر تو انہوں نے انسانی مصائب و مشکلات پر اس قدر جذباتی اور دردناک شاعری کی ہے، کہ دل چیر کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پر دل میرا
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

سرمایہ داری، ملوکیت و استبدادیت کے خلاف انہوں نے جو جدوجہد کی اور اس سلسلے میں عرب فرمانرواؤں مصلح ترکی مصطفیٰ کمال اتاترک اور رضا شاہ خاں، شاہ ایران کے بارے میں جو کچھ لکھا انہی کے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ مغربی نظام استعمار کو انہوں نے مختلف مفکرین کی مخصوص سوچ

کے مطابق جیسے بیان کیا اسے بھی بغیر کسی مبالغے کے قلمبند کردیا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس پر انہوں نے اشتراکیت کی پرزور تائید کی اور اسے اسلام کے قریب تر قرار دیتے ہوئے جو کچھ کہا اسے جوں کا توں بیان کردیا گیا ہے۔

یہ وحیِ دہریتِ روس پر ہوئی نازل،
کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات

مختصر یہ کہ اس کتاب کا مقصد کسی ایک نظریئے کی بے جا حمایت نہیں بلکہ عظیم مفکرِ مشرق کی اس جدوجہد و کاوش کا بیان ہے جو انہوں نے انسانیت دشمن فلسفے اور استحصالی نظام کی بیخ کنی کے لئے قلمی جہاد کے طور پر کی اس راہ میں جو مقامات آئے اور جو کیفیات ان پر طاری ہوتی رہیں ان کا معروضی اظہار ہی قاری کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ ان کے کسی بھی خیال کے ساتھ مستند حوالہ جات اور بیانات واضح کردیئے گئے ہیں تاکہ قارئین کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ رہے اس کے باوجود اگر کوئی فرد تعصب سے کام لے تو اس کا کوئی حل نہیں۔ البتہ اقبال تو ایسے متعصب اور خود غرض فقہا تک کے بارے میں کہتے ہیں :۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

الغرض جہاں سیاسی پس منظر دینا ضروری تھا وہاں انتہائی اختصار سے کام

لیا گیا۔ کیونکہ اصل مقصد سامراج کے خلاف جہدِ اقبال کی کڑیاں ملانا تھا تاکہ ایک واضح تصویر ابھر سکے۔

آخری ضروری بات یہ کہ اس کتاب کی تصنیف میں مجھے بے شمار کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا۔ کیونکہ خان پور جیسے چھوٹے سے شہر میں حوالے کی کتب ملنا دشوار تھیں۔ چنانچہ کبھی لاہور اور کبھی کراچی تک جانا پڑا مگر پیشے سے انصاف بھی ضروری تھا۔ بہر حال اس تخلیق کے لئے کسی مدد کے بغیر جہاں تک ہو سکا اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لیا۔ تاہم دیگر تحقیقی و طباعتی مشکلات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہی قرینِ انصاف ہوگا۔

محمّد گلزار راحت

ایم۔ اے جرنلزم

ایم۔ اے پولیٹیکل سائنس

لیکچرار

گورنمنٹ ترقئ تعلیم کالج خانپور ضلع رحیم یار خان

تہذیب

انگریزی زبان میں تہذیب کے لئے (culture) کی اصطلاح ہوتی ہے کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپوں اور بیکٹریا کی پرورش یا افزائش کرنا جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی کھیتی باڑی کرنا۔ اردو فارسی و عربی میں کلچر کے لئے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا چھانٹنا و تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں فارسی میں تہذیب کے معنی "آراستن پیراستن، پاک و درست کردن و اصلاح نمودن" ہیں۔ اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے رہن سہن، فنونِ لطیفہ علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد، اخلاق و عادات، رسوم و روایات عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔" اسے کسی بھی زمانے یا قوم کی سماجی اقدار کو تہذیب کے ان معینہ مظاہر کی کسوٹی پر بآسانی پرکھا جا سکتا ہے

پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء از سید سبط الحسن ص ۱۷

استعمار

اُردو لفظ استعمار کا انگریزی مترادف (Imperialism) ہے یہ نظام سرمایہ داری کا نقطۂ عروج ہے جس میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو زیادہ نفع بخش طریقے پر لگاتے۔ خام مال کی منڈیوں پر قبضہ کرتے اور اپنی مصنوعات کی برآمد کے لئے دوسرے ملکوں پر براہ راست قبضہ کرتے یا انہیں سیاسی و معاشی طور پر اپنا محکوم بناتے ہیں یہ اصطلاح سب سے پہلے انیسویں صدی کے آخر میں استعمال ہوئی اس کا مقصد قرونِ وسطیٰ کی وسیع سلطنتوں اور دورِ جدید کی سلطنتوں میں فرق کو واضح کرنا تھا۔ انیسویں صدی میں مغربی استعمار کی واضح مثال برطانیہ کا سرمایہ داری و ملوکانہ نظام تھا دورِ حاضر کی سب سے بڑی (Imperialist) استعماری طاقت امریکہ ہے۔

لغاتِ سعیدی میں استعمار کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

" استعمار ۔ کسی وحشی یا گمنام مقام پر سلطنت کا قابض ہوکر اس کی آبادی بڑھانا اور وہاں علم و تہذیب پھیلانا"

ویبسٹر انگلش ڈکشنری میں استعمار کی تشریح اس طرح سے ہے

" اس جدید دور میں ایسی حکومت جو شاہانہ اختیارات یا طرزِ حکومت کی حامل ہو اور جس میں یہ خصوصیات نمایاں ہوں۔ عالمی منڈیوں اور خام مال پر تسلط کا جذبہ (۲) دیگر علاقوں کی محکومی اور ان پر قبضہ کی خواہش ۔ (۳)

مقبوضہ علاقوں میں نوآبادیات کا قیام "۔

نیو ورلڈ ڈکشنری کی تعریف یوں ہے کہ (i) شاہی مملکت یا ایسی حکومت جو شاہانہ اختیارات یا طرزِ حکومت کی حامل ہو جس کا نظام اس طرح سے تشکیل دیا گیا ہو کہ اس سلطنت کا انحصار دوسرے ممالک کو فتح کر کے ان کی عالمی منڈیوں اور خام مال کے حصول پر ہو۔ (ii) نوآبادیوں کا قیام (iii) ایسی پالیسی بنانا اور اقدامات کرنا جس کی بدولت ترقی پذیر یا کمزور ممالک کے سیاسی و اقتصادی معاملات پر غالب آسکے "۔

تہذیبوں کا عروج و زوال

جب کوئی قوم سماجی اقدار کے بام عروج تک پہنچتی ہے تو اس کی تہذیب دیگر اقوام کے لئے قابلِ رشک و قابلِ تقلید حیثیت اختیار کر جاتی ہے اگرچہ اس سے ہمہ گیر اثر و نفوذ میں عسکری و صنعتی قوتِ بہت اہم کردار ادا کرتی ہے تاہم یہ طاقت بھی مذکورہ تہذیبی مظاہر ہی کی مرہون منت ہے چنانچہ دنیا کی دیگر اقوام کی تہذیبوں کے چراغ اس قوم کی تہذیب کے سامنے ماند پڑنا شروع ہو جاتے ہیں ان اقوام کے دانشور طالب علم مفکرین اور محققین اکتساب علم کے لئے اس ترقی یافتہ قوم سے رجوع کرتے ہیں ۔

مصر و بابل اور یونان و روما جیسی درخشندہ تہذیبیں اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں ۔ جو کبھی تہذیب و تمدن جاہ و سطوت اور علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھیں ۔ دیگر قومیں ان ہی سے علم و عرفان کے چراغ روشن کیا کرتی تھیں ۔

مصر و بابل کی مشرقی سلطنت کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کے ہاتھوں یونانی تہذیب کا خاتمہ ہوا ۔ جس نے دنیا کو جمہوریت کی ایک اچھی مثال مہیا کی تھی اس کے بعد سلطنت روما کا عروج شروع ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان جرمنی، سپین ، فرانس ، یونان اور بحر روم کے ساحل تک جا پہنچی ۔ ایک صدی کے بعد اس تہذیب کا بھی خاتمہ ہوا چھٹی صدی کے شروع میں اس کی جگہ جاگیر داری نظام نے لے لی ۔ اس دوران پاپائے روم نے حکمرانوں پر اپنی فوقیت جتانی شروع کر دی جس سے کلیسا اور ریاست کے جھگڑے کی ابتدا ہوئی ۔ سولہویں صدی میں انگلستان کے ٹیوڈور بادشاہوں کے ہاتھوں جاگیر دارانہ

نظام کو زوال آیا اس کی جگہ قومیت کا جذبہ ابھرا اور قومی ریاستیں وجود میں آئیں
اس زمانے میں فرانس جرمنی ، سپین اور اٹلی بھی قومی ریاستیں بن گئیں ان میں
اتحاد کا رشتہ مشترکہ نسلی زبان مگر مذہب یا رہائش تھا ۔

آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں ایک تہذیب ایک سلطنت
ایک قوم چراغِ سحر کی طرح زندگی کے آخری سانسیں لے رہی ہوتی تو دنیا کے
کسی دوسرے کونے میں ایک نئی تہذیب کا سورج طلوع ہو رہا ہوتا ۔ بعض
مغربی مفکرین نے اس رازِ سربستہ پر تحقیق و تجسس سے کچھ پردے وا کئے
ہیں ۔ ان کے مطابق قومیں بھی نباتات و حیوانات کی طرح ایک مادی وجود رکھتی
ہیں (مادہ معینہ عرصے بعد اپنی شکل بدل لیتا ہے) جو انہی کی طرح زندگی کے
مختلف ادوار سے گذرتی ہیں اور آخر کار اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہیں ان
اقوام اور ان کی تہذیبوں کے عرصۂ حیات کا تمام تر دار و مدار حصولِ علوم و فنون
اور جذبۂ تحقیق و جستجو پر ہے ۔ جو قوم جتنا عرصہ طاؤس و رباب سے دور جستجو اور
تگ و دو سے نئی جہتیں تلاش کرتی رہی وہ اتنا عرصہ دیگر اقوام عالم
کے لئے مینارۂ نور بنی رہی ۔ قریباً چھ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن
اقوامِ مشرق و مغرب کے لئے رہنمائی و رہبری میں پیش پیش تھی یہ وہی دور
تھا جس میں مسلمانوں نے علوم و فنون ، طب و حکمت ، سیاسیات و معاشیات
رزم و بزم ، سائنس و ادب ، ایجاد و اختراع اور تعمیر و ارتقاء کی بلندیوں کو چھوا
ابن الہیثم ، ابن سینا موسیٰ بن شاکر الخوارزمی ، ابوبکر رازی ، طوسی ، الکندی
جیسے محققین و مفکرین کی نگارشات و تجربات کی بدولت ریاضی ، فلکیات ، طب
علومِ طبعی اور فلسفہ جیسے علوم میں جدید یورپی فکر کی بنیادیں مسلم تہذیب و

سلطنت ہی تے رکھیں یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں یورپ سے لوگ حصولِ علم کے لئے اسلامی مراکز میں آیا کرتے تھے۔ اس دور میں کئی عیسائی علاقوں میں اسلامی ثقافت نفوذ کر گئی ہسپانوی عیسائی کئی عیسائی علاقوں میں عربی نام لباس بود و باش، رسم و رواج اور خوراک کے معاملے میں مسلمانوں کی تقلید کیا کرتے تھے حتیٰ کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے روز بروز بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ اور اسلامی فکر سے متاثر ہونے والے عیسائی دانشوروں کو روکنے کے لئے عیسائیوں کو ۹۳۶ء میں ایک کونسل قائم کرنا پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تمدن کے عروج کی ان ہی چھ صدیوں کو اہلِ مغرب (Dark age) یعنی تاریک دور کا نام دیتے ہیں۔

غرضیکہ خلفائے اسلام کی حدودِ سلطنت لبِ سندھ سے ساحل اوقیانوس اور بحیرۂ خزر (caspean sea) سے ساحل دریائے نیل تک پھیل چکی تھیں۔ ایک ہزار سال یعنی قریباً پندرھویں صدی تک مسلم تہذیب و تمدن اہلِ یورپ کے لئے قابلِ رشک تھی لیکن مشرقی یورپ پر ترکی غلبے کے بعد مسلم قوم کی زوال پذیری شروع ہوئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ روم و یونان کے مفکرین و محققین اٹلی اور دیگر یورپی ممالک کی طرف ہجرت کر گئے۔ مگر سب سے بڑی وجہ یہ ہی تھی کہ ایک عرصے سے مسلمانوں میں اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ جس قوم میں سوچ کے دروازے بند ہو جائیں تحقیق و جستجو کے جذبات مغلوب ہو جائیں اس کی حالت جوہڑ میں ٹھہرے ہوئے متعفن پانی کی سی ہو چکی ہوتی ہے۔ تمام تہذیبی مظاہر بلندی کی بجائے پستی

کی طرف آنا شروع ہو جاتے ہیں یوں طاقتور اور عروج حاصل کرتی ہوئی قومیں رفتہ رفتہ ان کی سیاست و معیشت کے ساتھ ساتھ تہذیبی مظاہر پر بھی چھا جاتی ہیں اپنے خطبۂ الہ آباد میں علامہ نے اسی المیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔"

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

ہر دور میں حکمران قوم نے مفتوح اقوام کے اقتصادی و سماجی ڈھانچے کو تہہ و بالا کر کے مخصوص مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ کہیں بزورِ شمشیر اور کہیں محکوم شہریوں نے بذاتِ خود حکمران طبقے کی زبان، رسوم و رواج اندازِ نشست و برخاست اندازِ بول چال اور ثقافت کو ذوق و شوق سے اپنایا ہے۔ برصغیر کے حالات گواہ ہیں کہ انگریزوں نے جن شہریوں کو مراعات اور زر و جواہر یا جاگیروں سے نوازا انہوں نے خود کو ان کے ہاتھوں کس طرح بیچا اور کالے انگریز بن کر ان کا طریقہ بود و باش اور تمدن و ثقافت اپنا کر اپنے ہی بھائیوں و ہم وطنوں پر اغیار کا سکہ جمانے کی فکر میں رہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اقبال نے اسی طبقے کے بارے میں لکھا کہ "مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔" جبکہ دوسرا طبقہ جس سے انگریزوں نے حکومت چھینی یا ان کی سماجی و اقتصادی حالت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف فرنگی راج بلکہ فرنگی وجود تک کا دشمن بن گیا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس طبقے کو بزورِ شمشیر زیر کرنے کی

کوشش کی۔ لارڈ میکالے نے ایسا نظام تعلیم مرتب کیا کہ ایک طرف تو انہیں ہندی نظام حکومت چلانے کے لئے کالے انگریز میسر آتے گئے اور دوسری طرف بے مقصد تعلیم سے تعلیمی ادارے کلرکوں کی پیداوار کے کارخانے بن گئے اسی تعلیم کے ساتھ مغرب کا مادی نقطہ نظر بھی در آیا اور نوجوان طبعی سائنس و منطق و فلسفہ کی جاذبیت میں کھو کر خدا اور مذہب سے دور ہوتے چلے گئے ان ہی حالات میں اقبال کو کہنا پڑا کہ :-

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

فرنگی تہذیب کا عروج

سولہویں صدی سے یورپی اقوام میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی تو انہوں نے ماضی کی عظیم اقوام کی کتب سے اکتساب علم کرتے ہوئے بے شمار علوم و فنون کے عربی اور رومی سے تراجم شروع کر کے متوقع فرنگی اقتدار کی بنیادیں مضبوط کیں ان کتب میں پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اس لئے بیسویں صدی میں یورپی علماء کے نظریات و انکشافات کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا "یورپ کے علماء بیسویں صدی میں جن نظریات و انکشافات کو اپنے لئے نئی چیز سمجھتے ہیں ان پر عرب علماء و فضلاء صدیوں پہلے سیر حاصل بحثیں کر چکے ہیں۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت یورپ کے نزدیک نیا ہو تو ہو لیکن علمائے اسلام کی کتابوں میں صدہا سال پہلے اس کے مبادی زیر بحث آ چکے ہیں برگسان کے فلسفۂ امتیازی کو سمجھنے کے لئے ابن خلدون کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔[1] جاگیرداری نظام کی بدولت چھٹی صدی سے سولہویں صدی تک مغرب میں کلیسا کی استبدادی حکومت قائم تھی۔ رفتہ رفتہ کچھ نئے فرقے پیدا ہوتے گئے۔ جو کلیسا کے علاوہ رہبری کے زعم اور لالچ میں آپس میں اُلجھ گئے۔ اسی اثناء میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک کا آغاز ہوا پھر لوتھر کی پروٹسٹنزم تحریک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ نتیجتاً کلیسا کا سحر ختم ہو گیا عوام میں علیسائیت

---

[1] گفتارِ اقبال صد ۱۷۲

کی جگہ آزاد خیالی نے جنم لیا تو وہ مذہب سے بیگانہ ہو گئے۔ بالآخر مغرب نے عافیت اس میں سمجھی کہ سیاست اور مذہب کو الگ کر دیا جائے۔

مشرق میں موجودہ مذہبی جمود اور غلبے کی طرح اس وقت مغرب میں بھی نئے علوم و فنون کو مذہبی کتاب بائبل کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تسخیرِ فلک اور ماہ و انجم کو بھی دینی تعلیمات سے متصادم قرار دیتے ہوئے اسے خدا سے مقابلہ اور بائیبل کی تعلیمات کے مخالف کہا گیا۔ چنانچہ مغربی سائنس دانوں اور ماہرین علوم و فنون کے نزدیک دو ہی راستے تھے کہ یا تو طبعی و تجربی سائنس میں نت نئے تجربات و ایجادات سے ہاتھ کھینچ لیں یا پھر کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں۔ کیونکہ ثانوی طریقے پر عمل پیرا ہونے سے اہل مغرب کا مستقبل تابناک تھا چنانچہ طبعی سائنس نے عملی تجربات کی بدولت دینی عقائد و نظریات غلط ثابت کرتے ہوئے سائنس و فلسفے کو اوج ثریا تک پہنچا دیا۔ اس تصادم میں لوگوں کی بڑی تعداد پادریوں و چرچ سے متنفر اور جدید سائنس کی معتقد ہوتی چلی گئی۔ یوں مغرب میں طبعی سائنس کی بدولت جو صنعتی یا سائنسی ترقی ہوئی تو انسانوں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ اقبال نے مغرب کے اسی علم و فن کو فرنگی تہذیب کی قوت و ترقی کی اصل بنیاد قرار دیا ہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ‏ نے ز رقصِ دختران بے حجاب

نے ز سحر ساحران لالہ روست ‏ نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست

محکمی او را نہ از لادینی است ‏ نے فروغش از خط لاطینی است

قوتِ افرنگ از علم و فن است ‏ از ہمیں آتش چراغش روشن است

اسی قوت و ترقی کی بدولت تجارتی و صنعتی اشیاء کی تیاری بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی تو جہاں ایک طرف خام مال کی ضرورت پیش آئی وہاں نئی منڈیوں کی تلاش کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اسی دور سے یورپی خصوصاً برطانوی استعمار کا آغاز ہوتا ہے منڈیوں کی تلاش اور خام مال کے حصول کے لئے کمزور مشرقی اقوام پر عسکری یلغار یا تجارت کے بہانے ان پر غلبہ حاصل کیا گیا پھر انہیں سے حاصل کردہ خام مال کو مشینوں میں ڈھال کر مصنوعات کی شکل دے کر دوبارہ انہیں کے ہاتھوں بھاری داموں فروخت کا سامراجی سلسلہ شروع ہوا جو ان اقوام کی روز افزوں سائنسی و صنعتی ترقی کی بدولت اب تک قائم ہے۔
تاریخ گواہ ہے کہ جب برصغیر کے فرنگی حکمرانوں کو یہ علم ہوا کہ مشرقی بنگال (سابقہ مشرقی پاکستان) میں انسانی ہاتھوں سے کھڈیوں پر خوبصورت ململ تیار کی جاتی ہے۔ جو انگریزی مال کے مقابلے میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے تو انہوں نے ان کاریگروں کے ہاتھ تک کٹوا دیئے تاکہ یہ لوگ بدیسی مال کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

مغربی تہذیب نے جاگیرداری نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف پلٹا کھایا۔ کھیتوں میں خون پسینہ بہانے والا کسان کارخانے میں محنت مزدوری کرنے لگا اور گاؤں کا زمیندار شہر کا سرمایہ دار بن گیا۔

یوں مغربی استعمار نے مشرقی اقوام پر یلغار کی اور ان کے سیاسی اقتصادی و سماجی ڈھانچے میں پنجے گاڑھ دیئے۔ بعد از ان انہوں نے اپنے ہی نامور مفکرین برٹرینڈ رسل و اسپنگلر وغیرہ کے ان نظریات (جن میں انہوں نے

انسانی تہذیب کو حیواناتی اور نباتاتی زندگی مشابہ قرار دیتے ہوئے اس کے منطقی انجام تک پہنچنے کی حقیقت بیان کی تھی) کی تکذیب شروع کر دی ان مغربی اقوام نے جبر واستبداد کے بل پر کمزور و محکوم مشرقی اقوام کو یہ تصور دینے کی کوشش کی کہ فرنگی اقتدار وعروج دائمی ہے تو مفکرِ مشرق حضرت علامہ اقبال نے ان کے اس تصور کو خام خیالی قرار دیتے ہوئے کہا: -؛

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

علامہ نے اپنی فہم و فراست اور مظلوم و محکوم اقوام کے تابناک ماضی ان کی درخشندہ روایات اور جذبۂ حریت کی بنا پر یہ پیش گوئی کی۔

ایشیائی مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باوجود اس قدر فاصلے پر ہونے کے ایشیاء کے تمام ممالک یعنی ہندوستان، ایران افغانستان، شام حجاز اور چین کے سامنے اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے۔ اس کے حل کرنے میں محققین نے جو طریق کار اختیار کیا اور اس کا جو حل تجویز کیا ہے اس کے اصولوں میں ایک نمایاں یکسانیت پائی جاتی ہے خیالات کا یہ اتحاد ایشیا کے مستقبل کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ ایشیا کو پھر عروج حاصل ہوگا۔ [۱]"

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
اگر نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

---

[۱] انجمن ہلال احمر مدراس سے خطاب ۷ جنوری ۱۹۲۹ء

مغربی تہذیب پر اقبالؒ کی تنقید کی وجوہات

بابل و نینوا اور یونانی تہذیبوں کی تباہی میں جو تہذیبی مظاہر کارفرما تھے وہی مہذب فرنگی تہذیب نے اپنا رکھے تھے۔ اس معاشرے میں افزائشِ حسن کے لئے عریانی و بے حیائی جیسے فیشن کا نام دیا گیا لازمی عنصر تھے۔ یونانی تہذیب کی طرح ان کے فنونِ لطیفہ FINE ARTS مصوری، فنِ تعمیر، ادب شاعری اور موسیقی جنسی جذبات کے ذرائع اظہار بن چکے تھے۔ فن کے نمود میں خونِ جگر پر جذبہ جنس غالب آچکا تھا۔ اسی لئے اقبال کو کہنا پڑا

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صورت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

اہلِ مشرق اپنی سنہری تہذیبی اقدارِ وحدت، اخوت، مساوات اموت حیا اور جہاد کو بھول کر مغربی تہذیب ہی کو جائے پناہ سمجھ بیٹھے تھے ان کے خیالات و نظریات، رسوم و روایات، فنون و ادب، نظام قانون، زبان و ثقافت، اخلاق و عادات، فلسفہ و حکمت۔ عقائد اور خاندانی تعصبات سب مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ ان کی اخلاقی و روحانی اقدار تباہ ہو چکی تھیں یہ بھی اقبال کی تہذیبِ مغرب کی وجہ مخالفت تھی وہ کہتے ہیں۔

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ
در جہانِ او دو صد فردوسِ رنگ

جلوہ ہایش خانماں ہا سوختہ

شاخ و برگ و آشیاں ہا سوختہ

ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست

دل ضعیف است و نگہ را بندہ ایست

غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا اساسی پیغام ہی یہ ہے کہ انسانیت کی ترقی و بقا کا راز احترامِ آدمیت ہے اور اس پیغام کی روشنی میں وہ ہر عقیدہ اور نظریہ کو پرکھتے ہیں۔ جہاں کسی نظریہ سے انسان کے احترام پر برا اثر پڑتا ہے علامہ اس نظریہ کو انسان کے لیے خطرناک اور مضر قرار دیتے ہیں۔ اسی نقطۂ نگاہ سے اقبال کی نظر میں یورپ کا وہ تمدن جس کی بنیاد شہنشاہیت، استعماریت اور قومیت پر ہے۔ کل انسانیت کے لئے ایک مہلک مرض ہے اور یہ کل بنی نوع انسان کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے باآوازِ بلند یورپ کو بتایا کہ جس تمدن کو وہ ترقی کی معراج تصور کر رہا ہے۔ وہ

درا اصل ترقی نہیں بلکہ قریب المرگ مریض کا ہذیان ہے[۱]

میں یورپ کے پیش کردہ نیشنل ازم کا مخالف ہوں اس لئے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آتے ہیں۔ اور یہ جراثیم میرے نزدیک دورِ حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں[۲]

---

۱ نقشِ اقبال از سید عبدالواحد متین ص ۲۳

۲ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا خطبۂ صدارت لاہور۔

فتنۂ را کہ دو صد فتنہ بآغوشش بود

دخترے ہست کہ در مہند فرنگ ہست ہنوز

اقبال کا پیغام ان کا کلام، ان کی فکر، ان کا تخیل سب کا مرکز احترام آدمیت و انسانیت ہے ۔:۔

آدمیت احترام آدمی

باخبر شو از مقام آدمی!

وہ جہاں بھی انسانیت کی تذلیل اور انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال دیکھتے ہیں تو اسے قیامت سے کم تصور نہیں کرتے۔[۱]

ابھی تک آدمی صیدِ زبوں یاری ہے

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

پھر انہیں تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔[۱]

یہ تو بظاہر ان کی مغربی تہذیب پر مخالفت کی ایک عام وجہ ہے مگر بنظرِ غائر ان کے کلام کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ مغرب کا روحانیت سے کنارہ کشی اختیار کر کے صرف مادی ترقی یا تسخیرِ آفاق ہی کو مدعا و منتہا ٹھہرالینا ہے۔" اقبال کا نظریۂ حیات ارتقائی ہے۔ اور یہ ارتقاء انسان کی مسلسل جد و جہد اور تخلیق کا نام ہے۔ فطرت کے جبر پر قابو پا کر خودی کی استواری اس کی تلقین کا ایک اہم عنصر ہے۔ کائنات النفس و آفاق

۱۔ اقبال نامہ صہ۱۴

پر مشتمل ہے اور ان دونوں کی تسخیر انسان کا وظیفۂ حیات ہے طبعی سائنس آفاق کی تسخیر کا نام ہے۔ اس لئے اقبال اس کو غلط اندیش اور غلط اوّل قرار نہیں دے سکتا اس کو صرف یہ شکایت ہے کہ اس یکطرفہ تسخیر نے انسان کی روحانی زندگی کا توازن بگاڑ دیا ہے۔[1]

اقبال کی تہذیب مغرب پر تنقید کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کی قوم غلامی و محکومی کے گھمبیر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس دور میں اسلامی تمدن روبہ زوال تھا جبکہ نہ صرف اقبال کا وطن بلکہ تمام اسلامی ممالک فرنگی ہوس اقتدار و نوآبادیات کے تحت غیر کی غلامی قبول کر چکے تھے اور اس کی ظاہراً ترقی سے مرعوب ہوئے جا رہے تھے۔ مغربی سماج میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہروی، عریانی، فحاشی اور آزادی نسواں کی وجہ سے بھی اقبال اسے ناپسند کرتے تھے۔

ہماری جماعت کا شیرازہ اسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو نہ ہو۔[2]

وہ یورپی تمدن کو انسان کے اخلاقی ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

یورپ سے بڑھ کر انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ آج اور کوئی نہیں۔[3]

(۱) فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص۲۰۵

(۲) مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۱ء، (۳) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص۲۷۶

اسی یورپی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں۔

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

یورپ انسان کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ اور اس کی مادیت پرستی نے اسے کاروانِ بے منزل بنا کر راہِ راست سے ہٹا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یورپ کی غلط روی سے اقبال نالاں نہ ہوتے۔ لیکن اس کے دور رس اثر نے انہیں اپنی قوم کو خبردار کرنے پر مجبور کیا اور انہوں نے قدرتی طور پر سخت الفاظ کا سہارا ڈھونڈا۔[1]

اقبال کی تہذیب مغرب پر تنقید کی آخری وجہ اس کا ظاہری دکھو کھلا پن ہے۔ ان کا کہنا بالکل بجا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اسی لئے وہ اقوام مشرق کو اس کی چکا چوند سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ خود ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک مغرب کے اس طوفان رنگ و بو میں رہے۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہوا۔

مے از مے خانۂ مغرب چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے نہ دیدم

---

[1] اقبال غیر مسلموں کی نظر میں از شمیم حسین سیال

اقبال اور غلامی

فکر اقبال نے غلام اقوام و افراد کو زندگی اور حرکت کا پیغام دیا ہے۔ وہ نہ صرف غلامی اور استحصالی قوتوں سے متنفر ہیں بلکہ غلاموں اور ان کے رہنماؤں کو بھی اس کا موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے انہیں ہدف ملامت بناتے ہیں۔ وہ قوم کی حالتِ غلامی پر گریہ و نوحہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مشرق و مغرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشتِ ما سرمایہ تعمیر غیر

زندگی برز و ر ا دِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خواب گراں

جب وہ اقوام مشرق کو حالت غلامی میں بھی جامد و ساکت پاتے ہیں تو فرنگی جبر و استبداد کی حشر سامانیوں سے مرغ زیرک کی طرح دم توڑتی ہوئی انسانیت کے لئے پکار اٹھتے ہیں۔

می کند بند غلاماں سخت تر
آشیاں در خانہ صیاد بند

در فضایش بال و پر نتواں کشود
با کلیدش ہیچ در نتواں کشود

گفت با مرغ قفس اے دردمند
آشیاں در خانہ صیاد بند

ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ

او نباشد ایمن از شاہین و چرغ

حدیت خواہی بہ پیچاکش میفت

تشنہ میر و بر نم تاکش میفت

چشم ہا از سرمہ آتش بے نور تر

بندۂ مجبور از و مجبور تر

از خوش مرغ زیرک دانہ مست

تار ہا اندر گلوئے خود شکست

الحذر از گرمیٔ گفتار او

الحذر از حرف پہلو دار او

از شراب ساتگینش الحذر

از قمار بدنشینش الحذر

اقبال نہ صرف غالب و آمر طاقتوں کے جور و ستم پر برہم ہوتے ہیں بلکہ محکوم و مقہور اقوام کو بھی اپنی کمزوری اور بزدلی پر مطعون کرتے ہیں وہ اہل مشرق کو یورپ کی غلامی پر ایسے ڈانٹتے ہیں جیسے بزرگ بچے کو اس کی کوتاہی پر ادر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غلام صدیوں تک اغیار کی غلامی میں رہنے کے بعد اس کے خوگر ہو ہی جایا کرتے ہیں جو بالآخر خواجگی کی استعماری خواہش پوری کرنے میں اس کی معاون ہوتی ہے۔

جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر،
افسوس کہ باقی مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں

اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے غلام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی۔ پختہ ہو جاتے ہیں خوئے غلامی میں غلام
انہوں نے ایک اردو نظم میں علماء حکماء اور شعراء کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے
ان کا کہنا ہے کہ غلام قوموں کے یہی نام نہاد دانشور ہیں جو انہیں غلامی کا نشہ
پلا کر شیروں کو رم آہو سکھاتے ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا علماء و حکماء بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں ایک

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ان کی خواہش ہے کہ غلاموں کے جسم روح عمر سے معمور ہو جائیں تاکہ وہ
اپنی اور اپنے سماج کی حالت میں انقلاب پیدا کر سکیں۔

ہر کہ بندِ خودی دارست مرد - ہر کہ با بیگانا نگاں پیوست مرد

عصر خود را بنگر اے صاحب نظر - در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ

وہ غلاموں کو فنونِ فرنگی کو پہچاننے کی نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس (فرنگی) فتنوں کو آستینوں میں چھپا دیکھنے کی کوشش کرو تاکہ تم اس کے زہر سے محفوظ رہ سکو۔

اے زا خونِ فرنگی بے خبر - فتنہ ہا در آستین او نگر

غلامی خواہ سیاسی ہو اقتصادی ہو یا تہذیبی اس سے کسی بھی قوم کی تمامتر ذہنی و جسمانی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں وہ بے بس و لاچار حالت میں کتے جانور سے بھی بدتر ہے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
یعنی از خوئے غلامی خوار تر است

گوہرے در شت و نے نذر قبا دو جم کرد
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

چہ گویمت کہ چہ بودی چہ کردہ چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیٔ محمود

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

غلامی کے تصور ہی سے علامہ نادم و شرمندہ ہیں وہ قوم کی غلامی پر جلتے ہیں غلامی سے اسے سخت نفرت دلاتے اور اس کی غلامی کا علاج

بھی بتاتے ہیں۔ وہ غلام اقوام کے قیام (صلوٰۃ) کو بے حضور اور اس کے اس سجدے کو بے سرور سمجھتے ہیں کیونکہ اس طرح عبادت یا خدا اور بندے کے درمیان حقیقی تعلق میں وہ کیفیت نہیں رہتی جو کہ بندۂ حر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے یہ سجدے اسے دنیاوی آقا (سامراج) کے سامنے جھکنے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ اقبال تصورِ عید کو آزادانِ شکوہ ملک و دین سے وابستہ سچی خوشی قرار دیتے ہوئے غلام قوم کی عید (مسرت) کو مومنوں کے ہجوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

از قیام بے حضور من مپرس ۔ از سجود بے سرور من مپرس
جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس ۔ قسمت مردانِ آزاد است و بس
مرد آزادے چو آید در سجود ۔ در طوافش گرد او چرخ کبود
ما غلاماں از جلالش بے خبر ۔ از جمال لازوالش بے خبر
از غلامے لذت ایماں مجو ۔ گرچہ باشد حافظ قرآں مجو
عیدِ آزاداں شکوہ ملک و دیں ۔ عید محکوماں ہجوم مومنیں

ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ اقبال غلامی کی اس حالتِ خجالت میں اس ہستی مبارک حضور نبی اکرم ﷺ کا نام تک لینا باعث عار سمجھتے ہیں اس حالت کو حالتِ فسق و فجور (کفر) تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گرچہ دانا حال دل با کس نگفت
از تو درد خویش نتوانم نہفت

تا غلامم در غلامی زادہ ام
ز آستان کعبہ دور افتادہ ام

چوں بنامِ مصطفیٰ ﷺ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتاں مانند دیر

تا نداری از محمد ﷺ رنگ و بو ۔ از درودِ خود میالا نامِ او

اقبال محکوم مشرقی اقوام کو فرنگی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے گُر رموز سے آگاہ کرتے ہیں کہ مشکلاتِ انسان بتانے اور انہیں پیغام بیداری دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مشکلاتِ انسان کا حل مشرق ہی کے پاس ہے :۔

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو
مومن خود کافر افرنگ شو

رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست
آبروئے خاوراں در دستِ تست

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند
رایت صدق و صفا را کن بلند

اے امیں دولت تہذیب و دیں ۔ آں یدِ بیضا بر آر از آستیں
قیز واز کارِ ہم بکشا گرہ ۔ تیشۂ افرنگ را از سر بنہ
دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ ۔ تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
زخم از و نشتر از و سوزن از و ۔ ما و جوئے خوں و امیدِ رفو

دین حق را زندگی از قوتِ است ۔ قوت ہر ملت از جمعیت است
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں ۔ قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

اقبال اور تہذیب مغرب

نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد جب یورپ رنگ، نسل، زبان اور علاقائیت پر مبنی قومیت کی دیواریں کھڑی کر کے استعماریت کے جنون میں امن عالم کی تباہی کی طرف گامزن ہوا تو مفکرین مشرق۔ اکبر الہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبالؒ اہل یورپ کی اس چال کو بھانپ گئے۔ چنانچہ انہوں نے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے مغربی سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اکبر الہ آبادی یوں گویا ہوئے۔

بنے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

مشرقی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزہ بھول گئے

انگریزی میں عظمت جہاں بانی ہے
ہم میں اک نشان علم روحانی ہے

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خون ہے یہ جوئے خون ہے
طو ہا فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے افسانہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا:-

ہمارے مشرقی معاشرت اظہار و عادات و اخلاق اور طرزِ بود و باش ان لوگوں نے ضائع کر دیئے۔ تہذیب و تمدن کے بعد اب مذہب کی باری آئی ہے۔ یقیناً اسے بھی قربان کر دیا جائے گا۔"

سید جمال الدین افغانی افغانستان کے شہری و یورپی استعمار کے خلاف لڑنے والے مشرقی مفکرین میں سے تھے۔
ان کے عزائم ان کی درج ذیل تحریر سے انہی کے الفاظ میں عیاں ہیں۔

My body is imprisoned for the freedom of mankind. I am being killed for the life of nation but alas ! the fulfilment of my Mission is not in sight."

اقبال نے اس مغربی استعمار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خلاف روحانی بنیادوں پر جہاد کا آغاز کرتے ہوئے لفظ اسلام کی تاویل کچھ اس طرح سے کی

"میں سماجی اتحاد کے لئے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا اس لئے خاک کا ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت میرے خیالات بہت کچھ مادیت کی طرف مائل تھے، سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں

ANDARD GENERAL KNOWLEDGE
M. DOGAR------PAGE—765 روزنامہ الہلال سے اقتباس

اور جب بھی اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہوتی ہے اسلام اور مسلم میرے لئے خاص اصطلاحات ہیں جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لئے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔"[۲]

لفظ اسلام کی مذکورہ اصطلاح کی تشریح کے بعد اس کتاب میں جہاں بھی لفظ اسلام اور مسلم استعمال ہوگا اس کے معانی بخوبی واضح ہوں گے کیونکہ اقبال ادیانِ مشرق کو اکثر اسلام ہی کے حوالے سے مخاطب کرتے رہے ہیں۔

" اقبال بڑے انسانیت پرست تھے۔ وہ اسلام کو محض ایک فرقے کے اندر محدود نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ انہیں معیاری طور پر ایک بھی مسلمان مسلمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے ان کی ہمدردیاں ہر اس شخص کے ساتھ تھیں جو ظلم کا شکار ہو یا جسے لوگ مجبور جان کر ستا رہے ہوں غالباً یہی وجہ تھی کہ جہاں انہوں نے ایشیا کے غم کو اپنا غم سمجھا وہیں مغرب کے ستم کے خلاف بطور ایک انسان کے آواز اٹھائی۔[۱]

مشکلات حضرت انساں از وست آدمیت را غم پنہاں از وست
در نگاہش آدمی آب و گل است کاروانِ زندگی بے منزل است
دانشِ افرنگیاں تیغے بہ دوش در ہلاک نوعِ انساں سخت کوش
آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

اقبال کی مقصدی شاعری عظمتِ انسانیت ہے وہ بنی نوع انسان کو یکجائی ، اتحاد و اخوت کا سبق دیتے ہوئے علاقائی قومی لسانی یا نسلی بنیادوں کو انسانیت

۱۔ اقبال بڑا اپدیشک از شہیم حسین سیال ص ۷۹
۲ - ایضاً

کے راستے کی رکاوٹیں سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے تہذیبی۔ سیاسی و اقتصادی استعمار کی راہیں استوار ہوتی ہیں ۔ اس لئے وہ نوع انسان کو اخوت کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اقبال نے اپنی تحریروں میں یورپ کی نظریۂ وطن کی شد و مد سے مخالفت کی وہ اس کی توجیح کچھ اس انداز سے کرتے ہیں ۔

میں یورپ کے نظریۂ وطنیت کا مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشوونما پانے کا موقع ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم پہنچیں گے بلکہ میری مخالفت اس بناء پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں ۔ جو میرے نزدیک انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے ۔ اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری جگہ ہے ۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے ۔ اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کے لئے زندہ رہے ۔ اور ان ہی کے لئے مرے نہ زمین کے اس ٹکڑے کے

لئے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی رابطہ پیدا ہو گیا ہے“ ۱؎

اقبال حصول علم کے لئے یورپ پہنچے تو انہوں نے فرنگی تہذیب و تمدن کا جو تلخ مشاہدہ کیا اس کا ان پر کیا اثر ہوا۔ ”اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا اس وقت میں یورپ میں تھا۔ اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا“ ۲؎

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اپنے اس بیان میں انھوں نے ایک سچے مسلمان کا آفاقی نظریہ پیش کیا ہے قیام یورپ ہی کے دوران جب انہوں نے مذہب سے متنفر نو دولتی سماج کو کلبوں، ہوٹلوں، عالی شان بنگلوں اور عام زندگی میں داد عیش دیتے ہوئے پایا تو بہ غور مشاہدے کے بعد مخمور استعماری اقوام کے بارے میں ڈرتا یا کہ تم جسے تہذیب و تمدن کا عروج سمجھ رہے ہو در حقیقت یہ تمہاری تباہی کا پیش خیمہ ہے یورپی سماج جن راہوں پر چل رہا ہے اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں چنانچہ مغرب کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے وہ اب زر کم عیار ہوگا

۱؎ خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء
۲؎ نظریات اقبال از کلیم نشتر

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اہلِ مغرب نے حکیم الامت شاعرِ مشرق کے اس تصوّر کو محض مغرب دشمنی پہ محمول کیا۔ دراصل دولت و ثروت کے نشے میں مست افراد اور اقوام ایسی پند و نصائح کو ایک مفلس کی فریاد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے یورپ کی ان تعیشات کی بنیادیں۔ استعماریت، شہنشاہیت اور قومیت تھیں کمزور مشرقی اقوام کا استحصال ہی ان کی پر تعیش زندگی کا ضامن تھا اس لئے یورپ اپنی ڈگر پہ چلتا رہا۔ جب اقبال نے یہ صورتحال دیکھی تو سخت ترین الفاظ میں کہا گویا ہوئے۔

پیرِ مے خانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی

مفکرینِ اقوام وملل کی دوربین نگاہیں ہمیشہ اہلِ وطن کو آنے والی تاریکی یا صبح سے باخبر کر دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت اقبال تہذیب مغرب کی ناپائیداری کی بات کر رہے تھے اس وقت مفکرینِ مغرب برٹرینڈ رسل، سپنگلر اور برنارڈ شا وغیرہ اہل یورپ کو غیر یقینی مستقبل سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ مشرق کو ایک نئی صبح کی نوید سنا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہلِ مغرب کی تمام تر ترقی اور دولت و ثروت کا دار و مدار ان اقوام مشرق کے استحصال پر مبنی ہے۔ جو کبھی یورپ پر حکمران رہی ہیں اس لئے اگر اہلِ مغرب موجودہ تعیشی زندگی کو دائمی سمجھ کر عیش و طرب میں کھوئے رہے تو ان کی تباہی و شکست یقینی ہے۔ اقبال نے حالتِ فرنگ کو جب اس کسوٹی پہ پرکھا تو انہیں وہ فحاشی عریانی

اور بے راہروی کے سیلِ بے پناہ کی رہگذر میں نظر آیا۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال نے نظم و نثر دونوں ذرائع سے فرنگی تہذیب کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔

"اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہیں اور یہ مخالفت اس کے رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یوں ہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عیش کی دلکش آمیزش ہے۔ لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصے و بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز ہی کہی لیکن یہاں اس کا ذکر نہ ہی کیا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے لطف اُٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جاندار لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آ گئی اگر کہیں مُلا کو بُرا کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی فرنگ کو بھی لپیٹ میں لے لیتا ہے

حالانکہ غزل کے باقی اشعار نہایت حکیمانہ اور عارفانہ ہوتے ہیں ۔ [1]

مذکورہ اقتباس میں فاضل مصنف نے کلام اقبال کے بارے میں بالکل بجا لکھا ہے ذیل میں اقبال کے چند خیالات اور ان میں جا و بے جا تہذیب فرنگ کے خلاف اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

عشق طینت میں فرو مایہ نہیں مثلِ ہوس
پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس

یوں بھی دستورِ گلستاں کو بدل سکتے ہیں
کہ نشیمن ہو عنادل پہ گراں مثلِ قفس

سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل
ہے کہاں قافلۂ موج کو پروائے جرس

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

۲۔ ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری آنکھ میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ

---

[1] ۔ فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم صہ ۱۹۵

۳ - اِک دانشِ نورانی اِک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی فکر کی فراوانی

اس پیکرِ خاکی میں اِک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی

مجھ کو سکھادی ہے فرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

۴ - تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

سبق ملا ہے معراج مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے تیرا
تیری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

مری نوا میں نہیں ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ اسرافیل دل نواز نہیں

سوالِ مے نہ کروں ساقیٔ فرنگ سے میں

کہ یہ طریقہ رنداں پاکباز نہیں

۶۔ فرد کے پاس خبر کے سوا کچھ نہیں

تیرا علاج نظر کے سوا کچھ نہیں

رگوں میں گردش خون ہے اگر تو کیا حاصل

حیاتِ سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب

کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ

وہ شے متاع ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال کو فرنگی تہذیب وتمدن میں جہاں بھی شروا ستعمار نظر آیا انہوں نے اسے طنز و ملامت کا نشانہ بنایا اور اس کے رازہائے درونِ خانہ سے پردہ کشائی کی۔ ذیل میں فرنگی تہذیب کے خلاف ان کی تگ ودو کو انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے جن میں انہوں نے فرنگی تہذیب کے رستے ہوئے ناسور پر شعری نشتر چلائے ہیں۔

دلِ بیدار نہ دادند بہ دانائے فرنگ

ایں قدر ہست کہ چشم نگرانے دارد

افرنگ زدہ مشرقی سے:-

ترا وجود سراپا تجلیٔ فرنگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

آہ مکتب کا جوانِ گرم خون! ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

تہذیبِ مغرب کی تہی آغوش عورت اور زن مرید مرد کے بارے میں حکیمِ

یورپ سے سوال کرتے ہوئے :۔

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

فحش و عریاں مغربی معاشرے پر طنزیہ تیر برساتے ہوئے :۔

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

آہ یورپ با فروغ و تابناک نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب حورِ جنت سے خوشتر حورِ غرب

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار

طائرک بلند بال دانہ و دام سے گذر

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں

بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش

از حیا نا آشنا آزادیش!

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ
درجہان او دو صد فردوس رنگ

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

موازنہ شرق و غرب :-

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
یہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ وہاں بدلتا نہیں زمانہ

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

رکھتا ہے اب تک مے خانۂ مشرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

آخر میں فرنگی مدنیت کی ناپائیداری اور اس کے زوال کی پیش گوئی پر مشتمل چند اقتباس ہیں :-

مغرب سے اہلِ نظر کی ناامیدی :-

اہلِ نظر ہیں یورپ سے ناامید
ان امتوں کے باطن نہیں پاک

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے — نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں — جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روحِ ناشکیب و عمیق — طریقۂ اب وجد سے نہیں ہے بیزاری
جنوں رموز زیرک و پردم ہے بچۂ بدوی — نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمہ جاری
نظر دورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ! — وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن — افرنگ کی مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

نوجوان نسل کو یورپ کی کورانہ تقلید سے باز رہنے اور اپنی تعلیمات پر غور و خوض کرنے کی تلقین کرتے ہوئے خودی کی ترغیب دیتے ہیں:۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان — سفالِ ہند سے مے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

یورپ میں یہودی رسوخ و غلبے کی پیشین گوئی:۔

تاریک ہے فرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جوانمرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

مغربی آزادی کیا ہے؟:۔

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشۂ خطرناک
جس قوم کے افراد ہیں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد
مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

ہنرمندی و خودداری کی تلقین

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و پرسخن ساز ہے نمناک نہیں
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے رنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

آنچہ از خاکِ تو رست اے مردِ حُر — آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند — خود گلیم خویش را بافیدہ اند
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر — چرب دستیہائے یورپ را نگر
قالی از ابریشمِ تو ساختند — باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش اخوی خورد — رنگ و آبِ او ترا از جا برد
وائے آں دریا کہ موجش کم تپید — گوہرِ خود را از غواصاں خرید

یورپی تہذیب کے زوال پر

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے　　حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

مرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے　　فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

جلوہ ہایش خانماں ہا سوختہ　　شاخ و برگ و آشیاں ہا سوختہ

کشتن بے ضرب و حرب آئینِ اوست　　مرگ ہا در گردشِ ماشین اوست

مے خانۂ فرنگ کیا ہے؟　　جہاں الٹی گنگا بہتی ہے :-

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ　　شوخ گفتاری ازاں دلم از دست ربود

گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی درمے　　صحبتِ دخترکِ زہرہ وش و نائے سرود

ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیرِ میش　　آنچہ مذموم شمارند نماید محمودا

تقلیدِ مغرب کے بارے میں مسلمانوں کی حالتِ زار۔

علمِ غیر آموختن اندوختی　　روئے خویش از غازہ اش افروختی

کشتِ خود از دستِ خود ویران مکن　　از سحابش گدیۂ باراں مکن

عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر　　در گلوئے تو نفس از تارِ غیر

بر زبانت گفتگو ہا مستعار　　در دلِ تو آرزو ہا مستعار

بادہ می گیری بجام از دیگراں　　جام ہم گیری بوام از دیگراں

آں نگاہش سرِّ ما زاغ البصر　　سوئے قومِ خویش باز آید اگر

می شناسد شمعِ او پروانہ را　　نیک داند خویش و ہم بیگانہ را

لست منی گویدت مولائے ما　　وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے　　ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

دم توڑتی ہوئی تہذیب جب اپنی انتہا کو پہنچے گی تو اس کی صورت

کیا ہو گی ؟

خود بخود گرنے کو ہے . پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

زندہ کر سکتی ہے ۔ ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت جو ہے خود لب گور

اہلِ مشرق کو نوید آزادی دیتے ہوئے :-

اب تیرا دور بھی آنے کو ہے اے فقیرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

اقبال کے نزدیک اہلِ مشرق اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار تہذیبِ مغرب کے خاتمے پر ہے ۔ جب فرنگی تمدن روبہ زوال ہو گا تو پھر کیا ہونا چاہیئے اقبال اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ۔

"مجھے یقین کامل ہے کہ پرانی دنیا جس کا ہیرو یورپ بنا ہوا ہے۔ خاتمہ پر پہنچ رہی ہے۔ اب نئی دنیا معرض ظہور میں آنے والی ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ ہندوستان ہی ہے جو مادہ پرستوں کی مغربی دنیا کو یہ عظیم القدر پیغام پہنچانے کے قابل ہو گا" [۱]

مسلمانوں کو تیار رہنا چاہیئے کہ تہذیبِ مغربی کے خاتمے پر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار ہے ، [۲]

علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب اٹلی اور فرانس گئے تو اٹلی کے ہیرو مسولینی نے آپ سے ملاقات کی اور اٹلی کے

---

[۱] انجمن ہلال احمر مدراس سے خطاب ، جنوری ۱۹۲۹ء [۲] ملفوظات از خواجہ عبد الوحید

لئے پیغام نصیحت طلب کیا تو آپ نے تہذیبِ مغرب کے زوال اور مشرق کی زندگی بخش تہذیب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا

" اطالیہ ابھی ایک نوجوان قوم ہے ۔ اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال آمادہ تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی و زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے؟ تہذیبِ مغرب کا سورج غروب ہونے پر اہل مشرق و مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

" اب دنیا اسلام کی طرف آرہی ہے ۔ لہذا مسلمانوں کو اس آنے والے دور کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے ۔ جس وقت تہذیب مغرب کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیئے ۔" ۱ے

۱ے اقبال بڑا اپدیشک از شمیم حسین سیال صـ۸۹
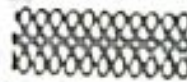
اقبال اشتراکیت اور فسطائیت میں مماثلت

بیسوی صدی کے اوائل میں مغربی تہذیب کے خلاف جو تحریکیں شروع ہوئیں ان میں فسطائیت و اشتراکیت سرفہرست ہیں۔ فسطائیت کا تعلق زیادہ تر نظام حکومت سے تھا یہ نسلی و قومی تحریک تھی اور اپنے نظریات میں انتہا پسند تھی کیونکہ اس کے بعض اصول مغرب کے شاہی اور قدامت پسند سامراج کے خلاف اور صنعتی و سائنسی ترقی کے حق میں تھے۔ اس لئے اقبال نے اس کی تعریف کی اور مسولینی کی ہمنوائی میں یہ نظم لکھی۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم!
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں،
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راج دھانی ہے، مگر باقی نہ راجہ ہے، نہ راج

آل سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام

تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں تجارت گری آدم کشی

کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

لیکن جب اس کے

داعی و راہبر (مسولینی) نے فرنگی سامراجیت کی طرح یورپ و افریقہ کو نوآبادی بنانا چاہا۔ تو اقبال اس کی حمایت سے دستبردار ہو گئے یہ تحریک جلد ہی دوسری جنگ عظیم کے بعد ختم ہو گئی۔

مغربی سرمایہ داری وصنعتی بے چینی کے انہی حالات میں ایک اور تحریک اشتراکیت نے یورپ ہی کے ایک ملک جرمن سے سر اُبھارا۔ اس کے بانی کارل مارکس تھے۔ انھوں نے اسے نہ صرف فلسفے یا اصولوں کی حد تک محدود رکھا بلکہ اس کی بنیاد انسانی معاشرے کے نئے تہذیبی و اقتصادی ڈھانچے پر رکھی۔ جس میں مذہب کو برگِ حشیش اور جدید سرمایہ داری نظام کا مضبوط ستون قرار دیا۔ اشتراکی انقلابیوں کارل مارکس اینگلس اور لینن نے اسے پائیدار مستحکم جدید تہذیب و تمدن اور نظامِ حکومت کے زریں اصولوں کا ایسا مجموعہ قرار دیا جو کسی بھی مذہب نظام یا تمدن کے مقابلے میں جدید ترین ہے اس لئے اس کے پیروکاروں کو جدت پسند اور مخالفین کو قدامت پسند کہا گیا۔ کیونکہ اس انقلابی تحریک کی بنیادیں سرمایہ داری ملوکیت اور مغربی استعمار کے شر و فساد کی بیخ کنی پر استوار کی گئی تھیں۔ اس لئے اقبال

بھی اس تحریک کے ہمنوا بن گئے۔" اقبال کی اشتراکیت سے دلچسپی کے کچھ اسباب نفسیاتی ہیں۔ اقبال دنیا کی تاریخ قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب وعلل سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے خصوصاً نئی تحریکیں انہیں متوجہ کرتی تھیں ان کا ذہن ایک محدود فضا میں رہنا پسند نہیں کرتا یکسانیت سے وہ جلد اکتا جاتے تھے۔"[۱] اسی لئے بال جبریل میں لینن خدا کے حضور جو کہتا ہے اقبال اس کی مکمل تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی ۔۔۔ مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنئ علم و ہنر ہے ۔۔۔ حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیوان ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں! ۔۔۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے ۔۔۔ سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل! ۔۔۔ بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

---

[۱] اقبال کا ادبی مقام از ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا ص ۳۹
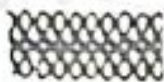
سیاست

لفظ سیاست کی انگریزی اصطلاح (Political) ہے۔ جو یونانی زبان کے لفظ (Polis) سے ماخوذ ہے جسے اُردو میں شہر کہا جاتا ہے۔ یونانی شہری ریاستوں میں رہا کرتے تھے۔ جس کی حدود موجودہ دور کے تقریباً ایک شہر کے رقبہ کے برابر ہوتی تھیں وہ شہر اور ریاست میں امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ انگریزی اصطلاح پولیٹکل سے مراد ایسے امور تھے جو شہری ریاست سے متعلق ہوں " علم سیاسیات عمرانی علوم کا وہ شعبہ ہے جو ریاست کی مختلف کیفیات اور حکومت کی اقسام و فرائض اور طریق کار کا باضابطہ مطالعہ کرتا ہے "[۱] یہ تو تھی مغربی نقطہ نظر سے سیاست کی تعریف جبکہ اقبال جیسے مشرقی مفکر نے سیاست اور مذہب کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اس کی بہت سی توجیہات ہیں۔

سیاسیات مسلمانوں میں کوئی علیحدہ شے نہیں بلکہ خالص مذہبی نقطۂ خیال سے کچھ شے ہی نہیں اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے[۲]

سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے۔[۳]

از روئے شریعت محمدیہ مذہب و سیاست میں کوئی تفریق و تمیز نہیں گویا ہمارے نزدیک مذہب و حکومت کے یکجا جمع کرنے کا نام سیاست نہیں بلکہ سیاست وہ عنصر غالب و منفرد ہے جس میں اس قسم کے فرق و امتیاز کی

۱۔ اصول سیاسیات از احمد شفیع چوہدری ۲۔ مکاتیب اقبال صفحہ ۳۔ حرف اقبال صفحہ

گنجائش ہی نہیں۔ ا ے

علامہ اقبال سیاست کو کسی طرح بھی مذہب سے جدا نہیں سمجھتے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سیاسی عفریت کو مذہبی و روحانی قوتوں کے کنٹرول میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ فرد واحد یا گروہی مفادات کی بجائے جمہور کی فلاح و بہبود اور عظمت انساں کا حامل ہو۔

" اسلام ابتداد ہی سے اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا۔ کہ فی الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل و امین ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فردِ واحد ما

ا ے مقالات اقبال ص۲۷
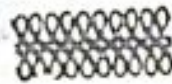
مغربی سیاسی استعمار کا ظہور

مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کے بعد جاگیرداری نظام کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لے لی تو صنعتی اور عسکری ترقی کی بدولت اس نے بے پناہ اقتصادی و سیاسی قوت حاصل کر لی ان کی اس قوت کا تمام تر دارومدار داخلی و خارجی حکمتِ عملی پہ تھا۔

سب سے پہلے انگلستان میں سیاسی بیداری کی لہر پیدا ہوئی بعد ازاں دیگر یورپی ممالک نے بھی اس کی تقلید میں اندرونی و بیرونی نظام ہائے سیاست و حکومت تشکیل دیئے۔ انگلستان میں جس جمہوریت کو سترھویں صدی عیسوی میں کامیابی نصیب ہوئی۔ یونان و روما بہت پہلے اس جمہوری نظام کو اپنا چکے تھے۔ یونان کی شہری ریاستوں میں عوام براہ راست امور مملکت میں حصہ لیا کرتے تھے۔ انہیں تمام تر شہری آزادیاں و حقوق حاصل تھے یہ لوگ عموماً دوسری ریاستوں سے الگ تھلگ زندگی گذارتے تھے ان میں سے اکثر ریاستوں میں سیاسی زندگی کا آغاز بادشاہت سے ہوا پھر امرا شاہی کا تجربہ کیا گیا جس کی ناکامی کے بعد جمہوری نظامِ حکومت اپنایا گیا۔ یونان ایک پہاڑی ملک ہے۔ یہاں کی اُونچی نیچی پہاڑیاں میدانی علاقوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں اس قدرتی تقسیم کی بدولت یونان میں ریاستوں کی علیحدہ تنظیم میں خاصی مدد ملی ہر شہری ریاست کے فوجی اور عدالتی انتخاب

کے علاوہ قانون سازی میں بھی براہِ راست حصہ لیتا تھا ان جمہوری ریاستوں میں ایتھنز سب سے مشہور ریاست تھی۔

اٹلی میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن میں روما کی شہری ریاست کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہاں بھی سیاسی نظام کی ابتدا موروثی بادشاہت سے ہوئی۔ بعد ازاں بادشاہ کی موروثی حیثیت ختم کر دی گئی۔ ایک سینٹ کا قیام عمل میں آیا جو بادشاہ کو نامزد کرتی تھی۔ اس طرح بادشاہ کے اختیارات میں کمی آتی گئی۔ بالآخر جمہوری نظامِ حکومت کو اپنایا گیا لیکن چند فتوحات اور نوآبادیات کے قیام کے بعد بادشاہ پھر مطلق العنان بن بیٹھا۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روما کو ٹیوٹانی (Teutonic) قبائل نے زیر کر کے آپس میں تقسیم کر لیا اور جاگیرداری دستور کو رواج دیا۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کی حیثیت ختم ہو گئی تو چرچ نے ریاست کے بہت سے اختیارات سنبھال لئے۔ پاپائے روم نے تمام حکمرانوں پر اپنی فوقیت جتانا شروع کر دی تو یہی کشمکش کلیسا اور ریاست کے مابین تصادم کا باعث بنی۔

جب جاگیرداری نظام کے خاتمے پر سب سے پہلے انگلستان میں قومی مملکتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ جن میں بادشاہ کو سیاسی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی گئی۔ رفتہ رفتہ سپین، اٹلی، جرمنی اور روس میں بھی قومی ریاستیں تشکیل دے دی گئیں۔ عوام کی جدوجہد سے ریاست اور کلیسا پہ بادشاہ کی برتری تسلیم کر لی گئی۔ لوگ مذہبی غلبے سے متنفر ہوئے تو کلیسا کو ریاست سے جداگانہ حیثیت دے دی گئی۔ اقبال اسی دوئی ملک

و دیں کا نوحہ پڑھتے ہیں۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ۔ سماتی کہاں اس فقیری میں میری

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں ۔ کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا ۔ چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ۔ ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی ۔ دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی ۔ کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تعلیم عام ہونے سے عوام میں شعور پیدا ہوا تو انہوں نے سیاسی حقوق کے لئے جدو جہد شروع کر دی۔ چنانچہ انگلستان میں عوام کے نمائندہ ادارے قائم کر دیئے گئے۔ بادشاہ کے اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ یوں عوام کے نمائندوں کو حقیقی قوت حاصل ہو گئی ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول پر بالواسطہ جمہوریت رائج کی گئی جس میں عملاً سرمایہ دار حاکم تھا۔ دیگر یورپی ممالک میں جب سیاسی شعور پیدا ہوا تو کہیں پر امن اور کہیں خونی انقلاب برپا ہوا بہر حال جمہوری نظام کو بہتر تصور کرتے ہوئے اسے اپنا لیا گیا۔

کلیسا اور سائنس میں تصادم کے بعد طبعی سائنس اور فنی علوم میں ترقی

کی بدولت انسانی ہاتھوں کی جگہ دیوہیکل مشینوں نے لے لی اس طرح سے بے شمار مزدور بے روزگار ہو گئے۔ ایک طرف تو سرمایہ دار اور تاجر، جاگیردار طبقے سے اختیارات چھیننے کی تکر میں تھے تو دوسری طرف مزدور طبقہ بدحالی کا شکار تھا ان حالات میں سرمایہ داری نے استعماریت کی راہ اپنائی، خارجی طور پر تیار شدہ مصنوعات کے لئے منڈیوں کی تلاش اور خام مال کے حصول کے لیے نوآبادیات قائم کی گئیں عسکری و صنعتی قوت کی بدولت مشرق کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے اکثر کمزور اور پسماندہ ممالک کو زیر نگیں کر لیا۔ اندرونِ ملک عوام کی بے چینی اور اضطراب دور کرنے کے لئے عوام کو اقتدار میں زیادہ سے زیادہ حصہ دے دیا گیا اس طرح جاگیردار کی جگہ بڑے بڑے سرمایہ دار کارخانہ دار یا تاجر اقتدار پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف مزدوروں پر ظلم ڈھاتے ہوئے جنگ زرگری شروع کر دی وہاں دوسری طرف نوآبادیات میں جبر و استبداد کا بازار گرم کر دیا۔ وہاں کے سیاسی ادارے تباہ و برباد کر دیئے اور ان کا اقتصادی و سماجی نظام تلپٹ کر دیا۔

برطانیہ کے بعد دیگر یورپی ممالک ہالینڈ، جرمن، بلجیم اور فرانس وغیرہ نے بھی قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر اندرونی خلفشار اور بے چینی دور کرنے کے لئے نوآبادیات بنانے کی ٹھانی چنانچہ یکے بعد دیگرے تمام مشرقی ممالک مغربی استعمار کا نشانہ بنتے چلے گئے مشرق کی فرنگی نوآبادیات میں زیادہ تر وہ افریشیائی ممالک شامل تھے۔ جو کبھی مشرق و مغرب پر

غالب تھے۔ ان کا دورِ حکومت جمہوریت سے کم نہ تھا۔ خلیفہ مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے منتخب ہوا کرتا تھا۔ اس کے طور اطوار عام مسلمانوں کی نظروں میں رہتے وہ شرعی حدود و قیود سے تجاوز نہ کر سکتا تھا۔ عوام کو تمام شہری حقوق حاصل تھے۔ غیر مسلم کو ریاست کے اہم عہدوں کے سوا تمام حقوق حاصل تھے۔ حکومت ان کے خانگی اور مذہبی فرائض میں مداخلت کی بجائے ان کے ان حقوق کا احترام کیا کرتی تھی۔ ایک عام شہری بھی حضرت عمرؓ جیسے عادل و منصف حکمران پہ دعویٰ کر سکتا تھا اور انہیں اس کے احتساب کا حق حاصل تھا۔ دائرہ اسلام وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تو مسلم مملکت مشرق و مغرب تک پھیل گئی۔ جب مسلمان قبائل و فرقے تعصب اور اقتدار کی ہوس میں خانہ جنگی کا شکار ہوئے تو ان کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ امیر معاویہ نے طریق حکومت کو بدل دیا اور ملوکیت کو رواج دیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس کے بیٹے یزید اور علیٰ ہذا القیاس دیگر افراد نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ آج تک مسلمان قوم پر اس کا اثر باقی ہے اکثر مسلمان ریاستوں میں مطلق العنان آمر یا شہنشاہ برسرِ اقتدار ہیں۔ آج بھی علماء اسی طرح آمر و جابر حاکم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جیسے امیر معاویہ کے دور میں تھے۔ انہی علماء کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اسلام میں کیونکہ مذہب اور سیاست یکجا ہیں اس لئے ان

فقیہانِ حرم کے اس منافقانہ رویئے کے باعث عوام کو سیاسی اداروں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جمہوری روایات فنا ہو گئیں۔ فلاحی ریاست کا تصور عنقا ہو گیا۔ مسلم قوم تنزلی کا شکار رہ گئی۔ ان کے علوم ان کی تبلیغ جمود کا شکار ہو گئی۔ اِس مقام پر انہیں جھنجھوڑتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

کس طرح سے ہوا کند تیرا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

آگے چل کر انہیں پیغامِ انقلاب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

مسلمان قوم بدستور خفتہ و محکوم رہی نتیجتاً جس طرح صدہا برس قبل اسلام نے ایک انقلابی دین کی حیثیت سے جمہوریت، مساوات، عدل و آزادی کا علَم بلند کیا تھا۔ بہت سی اقوام کو اسلام کے زریں اصولوں کا قائل کرتے ہوئے انہیں اسلامی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ اس طرح سولہویں صدی سے خوابیدہ مغربی اقوام نے انگڑائی لی۔ انہوں نے جمہوریت، مساوات اور عدل جیسے حسین الفاظ کا سہارا لے کر کمزور مشرقی ممالک پر یورش کر دی یوں محکوم اقوام کا سیاسی و سماجی نظام بُری طرح مسخ کر کے وہاں آمرانہ حکومتیں قائم کر دیں

اقبال اور جمہوریت:

یورپی نوآبادیات کے مظلوم عوام نے جب اقتدار میں حصہ مانگنا شروع کیا تو انہیں انتخابات، جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا گیا۔ مشرقی مفکرین و علماء نے اہلِ فرنگ کی اس سامراجی چال کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ علامہ اقبال اسی استبدادی اور اجارہ دارانہ سیاست کے بارے میں محکوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں یہ مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق سب طبِ مغرب کے میٹھے مزے اور خواب آوری اثرات ہیں یہ سب سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری ہے۔ جسے تو گلشنِ رنگ و بُو سمجھ رہا ہے یہ محض ایک سراب ہے۔ اس میں تجھے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ آہ! اے ناداں تو قفس کو بھی آشیاں سمجھ بیٹھا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین واصلاحات و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

مغربی سیاسی استعمار کے لئے جمہوریت جدید ترین اور بہترین نظام حکومت تھا۔ جبکہ اس نظام کے تحت پارلیمنٹ میں جانے کے لئے دولت بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ علم اخلاق، قابلیت یا جرات و بیباکی یہاں کسی کام نہیں آتی نہ ہی ان ارکان کی دیگر صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے بلکہ مجموعی طور پر کسی پارٹی نے جو منشور یا دستور مرتب کیا ہے اس کی کامیابی اور اطلاق کے لئے انہیں تمام تر صلاحیتیں وقف کرنا پڑتی ہیں۔ اقبال نے انہی عیوب کی بناء پر مغربی جمہوریت کی مخالفت کی ابتداء میں وہ آئیڈیل سلامی جمہوریت یا مساوات کی تصویر پیش کرتے رہے ان کی خواہش تھی کہ مدینے کی قدیم اسلامی و فلاحی ریاست کا ایسا نظام سیاست و حکومت اپنایا جائے جس میں حاکم وقت خادم عوام ہو وہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد بھی پورے کرتا ہو اسے یہ احساس ہو کہ اگر دریائے دجلہ سے فرات

تک ایک کُتا بھی بھوکا پیاسا مرگیا - تو وہ قیامت کے روز خدا کے حضور اس کا ذمہ دار ہوگا۔ مغرب کے سامراجی نظام میں غریب مزدور تو فاقوں مر رہے تھے جبکہ سرمایہ دار کا کُتا بھی ان انسانوں سے بہتر و اعلیٰ معیارِ زندگی کا حامل تھا۔ چنانچہ محنت کشوں نے انجمن سازی و دیگر ذرائع سے اتحاد پیدا کر کے پیدا کر کے سرمایہ داروں سے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کر دی برسرِ اقتدار سرمایہ دار نے اپنے روائتی ہتھیار پولیس فورس اور گولی کا استعمال کیا۔ نتیجتاً ہزاروں مزدور اس راہِ نجات میں کام آ ئے۔ آج بھی ان شہید مزدوروں کی یاد میں یکم مئی عالمی یوم مزدور کے طور پہ منایا جاتا ہے۔ بالآخر ان فاقہ مست انسانوں کا خون رنگ لایا۔ مزدوروں کے لئے کارخانوں کے قوانین تشکیل دیئے گئے' ان کے اوقاتِ کار مقرر کیے گئے ۔ اور حالاتِ کار بہتر بنانے کے علاوہ انہیں دیگر طبی و تعلیمی سہولیات بہم پہنچائی گئیں۔ یعنی اس سرمایہ داری نظام نے اعضائے کل کے حقوق میں بھی انصاف اور مساوات سے کام نہ لیا۔ اس جمہوریت میں طبقاتی نظام جوں کا توں قائم رہا۔ تاہم عوام کو یہی تاثر دیا گیا کہ جمہوری نظام کا مطلب ہے۔

GOVERMMENT OF THE POPLE BY THE PEOPLE & FOR THE PEOPLE -

اس میں ایک سرمایہ دار سربراہِ حکومت یا مزدور سب کو ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پہ یکساں اہمیت دی جاتی ہے جبکہ اس نظام میں PARASITE یعنی جونکوں کی طرح ایک طبقے کی بقا کا انحصار سراسر

دوسرے طبقے کے استحصال پر ہے چنانچہ مشرق میں جن ممالک نے
اس نظام کو اپنایا یا وہاں دوسروں کے خون پر پلنے والے ناخواندہ و جاہل
سرمایہ دار و جاگیر دار صاحبِ اقتدار و اختیار بن بیٹھے۔ آج کی غیر ترقی یافتہ مشرقی
اقوام اس ظلم و استحصال کی زندہ مثالیں ہیں۔ ان کے ایوا ہنائے اقتدار آول
تو کسی بھی تعلیم یافتہ مفلوک الحال شہری کی پہنچ سے بالا ہیں اگر ان میں سے چند
لوگ وہاں تک پہنچ بھی جائیں تو انہیں قانون سازی کے کسی بھی اہم مسئلے پر اتنی
اکثریت ہی حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ حاکم طبقے کے مفادات کے خلاف کسی
مسودے کو قانون کی شکل دے سکیں چنانچہ ایسا جمہوری نظام مشرق کے لئے
کسی بھی طرح سے کارآمد نہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اسی مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے
رقمطراز ہیں کہ " علامہ اقبال مغربی جمہوریت کے اس طریق کار کے مخالف
تھے جس کی وجہ سے قوم کے صالح اور عاقل افراد مجالسِ آئین سازی میں داخل
نہیں ہو سکتے بعض مشرقی ممالک نے جو مغربی طریق انتخاب اور اعضائے مجلس
کا تقلیدی ڈھانچہ اختیار کر لیا ہے۔ یا ان کے گذشتہ فرنگی حکمران مصلحتاً
اس کو رائج کر گئے ہیں۔ اس میں یہ عجیب و غریب نتیجہ نکلتا ہے کہ علم و فضل
والے اہل الرائے لوگ منتخب نہیں ہو سکتے ووٹ ایسے جاہل زمینداروں
کو ملتے ہیں جو اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے کسی شخص کو نہ تو اس کے علم کی بنا پر نہ موجودہ
سیاست و معیشت کے فہم و ادراک کی بناء پر اور نہ اس کے اخلاق حسنہ کی بناء پر
منتخب کر کے واضح قوانین بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ کہیں ووٹ برادری کی بدولت
ملتے ہیں۔ کہیں زمینداری اور سرمایہ داری کی بدولت اور کہیں کہیں عوام

کی ابلہ فریبی اور بے خلوص خطابت سے بھی مطلب حاصل ہوتا ہے غرضیکہ نہ علم نہ سیرت نہ معاملہ فہمی بلکہ زر و زمین سے حکمرانی میں حصہ ملتا ہے۔ یا نہایت ذلیل دروغ بافی اور جذبات انگیزی سے۔ اسی جمہوریت کے متعلق علامہ فرماتے ہیں کہ اس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ اور اس قسم قسم کے دو سو گدھے بھی اگر ایک ایوان میں ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کے لئے جمع ہو جائیں تو کوئی انسانیت کی آواز تو وہاں سنائی نہیں دے سکتی :-

متاع معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی

ز موراں شوخی طبع سلیمانی نمی آید

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مغربی جمہوریت محض ایک دھوکہ ایک فریب اور ایک سراب ہے۔ تاہم ابتداء میں ایک حد تک اقبال اسے قابل قبول سمجھتے تھے کیونکہ اس وقت تک اس کا کوئی متبادل نہ تھا انہوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء میں طلبائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

" جو چیز انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ڈیموکریسی ہے۔ جس صورت میں یہ ڈیموکریسی آچکی ہے کہ جو بمقدر کثیر آئندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی ذاتی طور پر میں اس ڈیموکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لئے اسے گوارا کر لیتا ہوں

کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں" چنانچہ اسی نظام کے تحت ایک مرتبہ آپ نے مجلسِ مقننۂ پنجاب کی ممبری کے لئے انتخابات میں حصہ بھی لیا جس سے آپ کو اس کا مزید تلخ تجربہ ہوا کہ ایک درویش منش عالم کو یہ طریقِ انتخاب زیب نہیں دیتا کہ وہ گھر گھر گلی گلی رسوا ہوتا پھرے اور خواہ مخواہ ایک مخالف دھڑا پیدا کر کے اس کے بے بنیاد اور رذیل پراپیگنڈے کا شکار ہوتا رہے۔ چنانچہ بعد ازاں آپ نے اس کوچۂ رسوائی کا رخ نہ کیا بلکہ اپنے عملی تجربے کی بدولت اسے سخت تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔

آپ نے اسی مغربی سیاسی استعمار کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے کہا کہ جب تک مغرب کی سیاست طبقاتی نظام جمہوریت قوم پرستی اور ملوکیت جیسی بنیادوں پر استوار ہے۔ انسانیت کو اس سے خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ کسی نظام کو خوبصورت الفاظ سے موسوم کرنا ہی کافی نہیں بلکہ "جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا جب تک انسان اپنے عمل سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا جب تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور حریت و مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے"[1]

وہ مغربی طرزِ سیاست کی مادہ پرستی کو انسانیت کے ہاتھوں میں ایسے اٹیم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جو کسی بھی وقت پھٹ کر اسے تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ اسی لئے اسے مست ہاتھی کی طرح دیو بے زنجیر قرار دیتے ہوئے

[1] سال نو کا پیغام - یکم جنوری ۱۹۳۸ء

کہتے ہیں۔

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

فرنگ آئین جمہوری نہاد است
رسن از گردن دیوے کشاد است

چہ رہزن کاروانے در تگ و تاز
شکم ہا بہر نانے در تگ و تاز

گروہے را گروہے در کمین است
خدایش یار اگر کارش چنین است

زمن دہ اہلِ مغرب را پیامے
کہ جمہوریت تیغ بے نیامے

چہ شمشیرے کہ جاں ہا می ستاند
تمیزِ مسلم و کافر نداند

مغربی قومیت کے لسانی رہائشی و نسلی امتیازات عالمی برادری کی راہِ اخوت و مساوات و حریت میں سنگِ گراں بلکہ باعثِ تفوق و انتشار ثابت ہوئے ہٹلر سولینی اور چرچل نے اپنی اپنی اقوام کو دوسری اقوام سے برتر و اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے تمام تر صلاحیتیں علم و حکمت، صنعت و تجارت کے ساتھ ساتھ مہلک ہتھیاروں اور گولہ بارود کی تیاری پر صرف کرنا شروع کر دیں جس کا لازمی نتیجہ استعماریت کی دوڑ میں ایک دوسرے

کو بھڑکانا تھا نتیجتاً یہ طاقتیں آپس میں اُلجھ پڑیں اور دنیا کو دو عالمی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ حکمت ناز تھا جس پہ خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

ان مغربی طاقتوں نے علم و حکمت اور سرمائے و عسکری حکمتِ عملی کے بل پہ اپنی نوآبادیات سے فوجی بھرتی کے ذریعے محکوم عوام ہی کو ان جنگوں کا ایندھن بنایا۔

مغربی جمہوریت محض ملوکیت کی بدلی ہوئی شکل ہے ملوکیت میں فردِ واحد مطلق العنان ہوتا ہے تو جمہوریت میں چند افراد اپنے ہی طبقہ کے مفادات کے لئے قانون سازی کرتے اور انہی مقاصد کے لئے طبقاتی معاشرہ و طریقِ حکومت تشکیل دیتے ہیں۔ اقبال ایسی جمہوریت کے خلاف پُرزور الفاظ میں کہتے ہیں۔

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

حلقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد
از امم بر تختہ خود چیدہ نرد۔

شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر
ہر زماں اندر کمینِ یک دگر

فاش باید گفت سرِ دلبراں
ما متاع و ایں ہمہ سوداگراں

دیدہ ہا بے نم زحبِ سیم و زر
ماوراں را بارِ دوش آمد پسر

وائے بر قومے کہ از بیم ثمر
می بُردنم زار اندام شجر

تا نیارد زخمہ از تارش سرود
می کشد نازادہ را اندر وجود!

وہ سرمادارانہ فرنگی نظامِ سیاست و حکومت کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ پاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا۔

گرانیٔ خوابِ چینی سنبھلنے لگے

ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم

تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیمؑ !

اقبال کا کہنا ہے کہ "فلسفی دنیا کی تشریح و تفسیر میں لگے رہے ہیں حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کو کیسے بدلا جائے"

سب اپنے اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں، اہل سیاست کے وہی کہنہ داؤ پیچ ہیں چنانچہ دنیا کو اس مہدیٔ برحق کی ضرورت ہے جس کی نگاہ اس عالم افکار میں ایک زلزلہ پیدا کر سکے۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیارا

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں

نے جدتِ گفتار ہے نے جدتِ کردار

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ

شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار!

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت

ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار ! !

سیاست افرنگ ایک ایسا جال ہے۔ ساری دنیا جس کا شکار ہے مگر مشرقی اقوام خصوصاً ایشیاء اس کا خاص ہدف ہے۔ اس لئے اقبال

کہتے ہیں۔

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ

پھر دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے اس مرض کے پس منظر سے آگاہ کرتے ہیں۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

علامہ اقوامِ مشرق کو فرنگی سحر اور اس کی بازیگری کے فریب سے بچنے اور مستقبل کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کے اطوار بتاتے ہوئے کہتے ہیں

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ
جام او روشن تر از آئینہ اسکندر است

چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں را نگاہ ساقیش پیغمبر است

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقل ناپروا متاعِ عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمی یک آہ بے تابانہ نیست
رند ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستان سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
نبی عفت و غم خواری و کم آزاری

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

"ترکانِ جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

مدتوں بعد ایران خوابِ غفلت سے بیدار ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اب پھر تقلیدِ فرنگ کا شکار ہو کر اپنا وہ مقام و مرتبہ ملک و نسب کے دیوتا کی نذر کر چکا ہے۔

بعد مدت چشم خود بر خود کشاد
لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ — خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
کار آں وارفتۂ ملک و نسب — ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب
روزگار او تہی از واردات — از قبورِ کہنہ می جوید حیات
با وطن پیوست و از خود در گذشت — دل برستم داد و از حیدرؓ گذشت
نقشِ حیرت می پذیرد از فرنگ — سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ !

تاریخِ ایران کے حوالے سے کہتے ہیں کہ رحمتِ خداوندی کی بدولت پارس (ایران) رومۃ الکبریٰ کی طرح تباہی سے بچ گیا اور دینِ محمدی کی رہنمائی میں اسے کھویا ہوا مقام و مرتبہ دوبارہ نصیب ہوا۔

پیرِ ایراں زبان یزدجرد — چہرۂ او بے فروغ از خونِ سرد
دین و آئینِ نظامِ او کہن — شید و تارِ صبح و شامِ او کہن
موجِ مے در شیشۂ تاکش بنود — یک شرر در تودۂ خاکش بنود
تا ز صحرائے رسیدش محشرے — آنکہ داد اورا حیاتِ دیگرے
ایں چنیں حشر از عنایاتِ خداست — پارس باقی رومۃ الکبریٰ کجاست ؟
آنکہ رفت از پیکرِ او جانِ پاک — بے قیامت برنمی آید ز خاک
مردِ صحرائی با یراں جاں دمید — باز سوئے ریگ زارِ خود رمید
کہنہ را از لوحِ ما بستر و رفت — برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت
آہ احسانِ عرب نشناختند — از تشِ افرنگیاں بگداختند !

آخر میں ایرانیوں کو پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید ہنر — اے برادر، ہمچو نور از نار و نار از نارون
بے ہنرواں نزد بیدیں ہم قلم ہم تیغ را — چوں بنا شد دیں نبا شد کلکِ و آہن را ثمن
دیں گرامی شد بدانا و بناداں خوار گشت — پیشِ ناداں دیں چو پیشِ گاؤ باشد یاسمن

لاجرم با عالمِ موجود ساخت
مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

صد نگیہا در نہادِ کائنات
نیست از تقلید تقویمِ حیات

زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور
جانش از تقلید گردد بے حضور

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است
ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید
نگاہش ملک و دیں را ہم دوتا دید

کلیسا سبحۂ پطرس شمارد
کہ رو با حاکمی کارے ندارد

بہ تقلید فرنگ از خود رمیدند
میانِ ملک و دیں ربطے ندیدند

ہچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس را

کرتہ آید وز دگر نیمہ یہودی را کفن

ایران کی طرح "یورپ کا مرد بیمار" ترکی بھی صدیوں سے تنزلی کا شکار تھا۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے سرفروشی اور جانبازی سے اس کو اعلیٰ مقام دلایا۔ بیرونی سازشوں یعنی یونانی و بلقانی ریاستوں کی بغاوتوں و اندرونی طور پر ارمنوں اور یہودیوں کی سازشیں فرو کرنے کے علاوہ برطانوی استعمار کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس پر شروع میں حضرت علامہ اقبال نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے خراج تحسین پیش کیا۔ لیکن جب اس نے بھی خلافت کے خاتمے کے بعد ایران کی طرح تقلید افرنگ کی طرف قدم بڑھانا شروع کئے تو اقبال اس مرد مجاہد کی طرف سے بھی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے ترکوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود

گفت نقش کہنہ را باید زدود

نو نہ گردد کعبہ را رخت حیات

گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست

تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

سینۂ او را دمے دیگر نبود

در ضمیرش عالمے دیگر نبود

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہم بر شود
نقش بندِ عالم دیگر شود

خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست
چشم شاں صاحب نظر دل مردہ است

زخم ہا خوردند از شمشیر خویش
بسمل افتادند چوں نخچیر خویش

زندگی را سوز و ساز از نارِ تست
عالمِ نو آفریدن کارِ تست !

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ
شوخ گفتاری ازاے دلم از دست ربود

گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی درے
صحبت دخترک زہرہ وش ونائے سرور

ایں خراباتِ فرنگ است و زتاثیرش
آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بہتر زوئے دگر سنجیدم
چشمہ داشت تراز وے نصاریٰ دیہود

خوب زشت است اگر پنجہ گیرات شکست
زشت خوب است اگر تاب و توان تو فزود

نقش باطل می پذیرد از فرنگ
سرگذشت خود بگیرد از فرنگ !

اقبال کے نزدیک سرمایہ داری و ملوکیت کا پرستار ہونے کے باعث مشکلات و مسائل میں اضافہ کا باعث تو ہو سکتا ہے۔ اس سے کسی بھلائی یا نیکی کی توقع عبث ہے انسانی مصائب و آلام کا خاتمہ صرف اور صرف مشرق ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔ مشرق کو اس کی نوید دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

غربیاں را زیر کی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات

سیاستِ افرنگ یا ابلیسی نظام

فرنگی سیاست کے بارے میں اقبال رقمطراز ہیں کہ اے باری تعالیٰ تُو نے تو صرف ایک ناری شیطان پیدا کیا۔ جس نے مخلوق خدا کو صراطِ مستقیم سے بھٹکا کر اسے ہوا و ہوس کا بندہ بنا دیا جبکہ سیاستِ فرنگ نے دو صد ہزار خاکی ابلیس بنا دیئے ہیں۔ چنانچہ اس کے شر اور فتنہ و فساد سے دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی تھی؟ فرنگی استعمار ایک ایسا ہی بت ہے جس کے پجاری صرف اور صرف یہی خاکی ابلیس ہیں کیونکہ وہ ان کی تکمیلِ حاجات و مفادات کا ایک وسیلہ ہے۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

ایسے شیطان اپنے سیاسی فرزندوں کو کیسے فرمان دیتے ہیں؟

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو!

ابلیس کی ایک عرضداشت ہے کہ دنیا میں ابلیس ہی اب اس جمہور کے اربابِ سیاست بن چکے ہیں۔ جو مجھ سے کہیں بڑھ کر ہیں اس لئے تہہ افلاک میری ضرورت ہی کیا ہے؟

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

اقبال کے نزدیک فرنگی استعمار ایسا ابلیسی نظام ہے جو شیطان کے تخیل کا کرشمہ اور اس کے اشاروں پر عمل پیرا ہے۔ اسی ابلیس نے فرنگی ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہب کے بارے میں مجلسِ شوریٰ منعقد کی ہے جو اپنے رفقا و مشیروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہوا ابلیس کا سوزِ دروں

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

ابلیس کے مشیروں میں سے پہلا ابلیس ملوکیت کے گُن گاتے ہوئے کہتا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

دوسرا مشیر سلطانیٔ جمہور کے غوغے کو بہتر شر جانتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمارا شر تو اس کے مقابلے میں جہاں کے تازہ فتنوں سے باخبر تک نہیں۔

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر پھر گویا ہوتا ہے کہ جونہی انسان ذرا خود شناس و خود نگر ہوا تو ہم نے خود ہی شہنشاہیت کو جمہوری لبادہ اوڑھا دیا ہے کیا تو

نے مغرب کا جمہوری نظام نہیں دیکھا جس کا چہرہ تو روشن ہے مگر باطن چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرا مشیر کہتا ہے

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب

اس سے بڑھ کے اور کیا ہو گا طبیعت کا فساد
توڑ دی آقاؤں نے بندوں کی طناب

چوتھا مشیر اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

توڑ اس کا رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب!

کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
گاہ بالا چوں صنوبر گاہ نالا چوں رباب

تیسرا مشیر دوبارہ گویا ہوتا ہے کہ

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب

یہ پانچواں مشیر پہلے تو اپنی طاغوتی قوت کا اظہار کرتا ہے۔ مگر جب بے یقین
مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مجھ سے بڑھ کر فطرت آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پہ نہیں ہے اعتبار

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ان شیطانوں کا سردار مشیروں و رفقاء سے خطاب کرتے ہوئے ان
کی ڈھارس بندھاتا اور اپنی قوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ہے میرے تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو!

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

آخر میں ابلیس مجلس شوریٰ کا سردار دوسرے سیشن میں سرمایہ داری

کے مقلد بندۂ مومن کے بارے میں اپنے چیلوں کو ہدایات دیتے ہوئے کہتا ہے کہ،

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اس میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہاں بے ثبات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اقبال اور ملوکیت

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است

از د امین نہ رومی نے حجازی است

اقبال ملوکیت سے سخت متنفر تھے ان کے نزدیک یہی وہ شر ہے جو اپنا عرصۂ حیات دراز کرنے کے لئے ظلم و تعدی کے بازار گرم کئے رکھتا ہے وہ ایسے ایسے ناکردہ کار گماشتے کلیسا، سرمایہ دار، جاگیردار و سود خوار کا طبقہ پیدا کر لیتا ہے جو ہوسِ استعمار میں مفلس شہریوں و مظلوم اغیار کا خون چوستے اور ملوکیت کو اس کا خراج ادا کرتے ہیں۔

رایت حق از ملوک آمد نگوں

قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

دار وئے بیہوش است تاج کلیسا وطن

جانِ خدا را د خواجہ بجامے خرید

علامہ اسی ناکردہ کار طبقے کو گدھ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں،

مہر در درمیانِ کارگاہاں

کشد خود را بہ عیش کرگسے چند

اقبال نے اکثر اپنی تحریروں اور اشعار میں مغرب کے نظریہ قومیت و وطنیت کو ملوکانہ اغراض کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اسے اسلام کی وحدتِ دینی اور عالمگیر اخوت کا بڑا دشمن قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں " مجھے یورپی

مصنفین کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ ؎

ان کا کہنا ہے کہ استعماری نظام سیاست و معیشت اور علم و حکمت فکرِ ملوکانہ ہی کی ایجاد ہے جو اس کے لئے تحفظات و قوت کی فراہمی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ کی ایجاد

وہ آمریت و ملوکیت کو ایک ہی سکے کے دو رُخ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ طاقت کے بل پر قائم شخصی حکومتوں میں بھی انہیں اہلِ مشرق کے لئے راہِ نجات نظر نہ آتی تھی وہ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کی ملوکیت اور مصطفےٰ کمال اتاترک کے اسی آمرانہ نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

ملوکیت کی خوبیاں اور اس کا جواز پیدا کر کے مسلمانوں کو سلاطین کا گرویدہ و پرستار بنانے والے خوشامدی مطلب پرست اور کم ظرف شیخ و امام کے بارے میں کہتے ہیں۔

؎ نظریۂ وطنیت کے بارے میں حسین احمد مدنی کو جواب ۹ مارچ ۱۹۳۸ء

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

یہ وہی ملوکیت ہے جس نے اسلام کے باہمی مشاورت و رضامندی سے خلفاء کے انتخاب جیسے سنہری اصولوں کو پائمال کر کے اس نظام کو شخصی حکومت کا روپ دے کر علماء و فضلاء کی زبان بندی سے ان کا خوشامدی طبقہ پیدا کر لیا۔ جب فکر و تخیل مقید ہوا تو اجتہاد و اجماع کے دروازے بند ہو گئے جس سے نظام اسلام تنزل کا باعث بنا۔ مسلم قوم کے اب تنزل و انتزاق کا ذکر کرتے ہوئے اقبال روح محمدؐ کے حضور عرض کرتے ہیں۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے!

قصرِ ملوکیت کی بنیادیں آمرانہ و جابرانہ اصولوں پر استوار ہوتی ہیں اور اگر اسی ایوان ملوکیت کا نام قصرِ جمہوریت یا پارلیمنٹ بھی رکھ دیا جائے تو جب تک اس کے بنیادی استحصالی اصول تبدیل نہ ہوں اس سماج اور اس کا نظام سیاست و معیشت اسی کہنہ طریق کار پہ سرانجام دیا جاتا رہے گا چنانچہ علامہ اسی ملوکیت کے بارے میں کہتے ہیں۔

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینۂ بے نور او از دل تہی است

مثل زنبورے کہ برگل می چرد

برگ راگلزار وشہید کش برد

شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں

بر جالش نالۂ بلبل ہماں !!

از طلسم و رنگ و بوئے ردگذر

ترک صورت گوی و در معنی نگر!

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است

گل مخواں او راکہ در معنی گِل است

اس ملوکیت کے بارے میں پہلے فرعون اور اس کے جواب میں مولانا

روم کہتے ہیں

اے جہانداراں سوئے من بنگرید

اے زیاں کاراں سوئے من بنگرید

وائے قومے از ہوس گردیدہ کور

می برد لعل و گہر از خاک و گور

پیکرے کو در عجائب خانہ ایست

بر لبِ خاموش او افسانہ ایست

از ملوکیت خبرہا میدہد

کور چشماں را نظرہا میدہد

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق
محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق

از بد آموزی زبوں تقدیرِ ملک
باطل و آشفتہ تر تدبیرِ ملک

باز اگر بینم کلیم اللہ را
خواہم از وے یک دلِ آگاہ را

مولانا رومی :-

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام
بے یدِ بیضا ملوکیت حرام

حاکمی از ضعفِ محکوماں قوی است
بیخش از حرمانِ محروماں قوی است

تاج از باج است و از تسلیم باج
مرد اگر سنگ است می گردد زجاج

فوج و زنداں و سلاسل

سید جمال الدین افغانی تا زیست مغربی استعمار کے خلاف سرگرم عمل رہے اقبال اسی آمریت یا ملوکیت کے بارے میں ان کی زبان سے آئین و دستورِ ملوک کا حاصل بیان کرتے ہیں کہ :-

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیرگردوں آمری از قاہری است

آمری از ماسوا اللہ کافری است

قاہر آمر کہ باشد پختہ کار

از قوانین گردِ خود بندد حصار

جرہ شاہین تیز چنگ و زود گیر

صعوہ را در کارہا گیرد مشیر

قاہری را شرع و دستور دہد

بے بصارت سرمہ با کورے دہد

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک

دہ خدایانِ فربہ و دہقاں چو دوک

ملوکیت کا مقصود بہر صورت حصولِ مال و زر ہے۔ اس کے لئے وہ لشکر کشی یا نشۂ جمہوریت ہر طریقِ کار سے مطلب برآری کرتی ہے بہر طور اس کے ان استعماری حربوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ عوام کو خواب غفلت میں کھوئے رکھیں۔ چنانچہ علامہ ایسی استعماری اقوام کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"گفت شیخ ایں زر حق سلطانِ ما است

آنکہ در پیرہن شاہی گدا است

حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است

شاہ ما مفلس ترینِ مردم است"

دیدہ بر خوانِ اجانب دوخت است
آتشِ جوعے جہانے سوخت است

قحط و طاعون تابعِ شمشیرِ او
عالمے ویرانہ از تعمیرِ او

خلق در فریاد از ناداریش
از تہی دستی ضعیف آزاریش

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انساں کارواں او رہزن است

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دو نیم

آتشِ جانِ گدا جوعِ گدا است
جوعِ سلطاں ملک و ملت را فنا است

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

ایک زمانہ تھا کہ عرب مشرق سے مغرب تک چھائے ہوئے تھے قیصر و قصریٰ جیسے ایوان ہائے ملوکیت ان کی ہیبت سے لرزاں تھے۔ پل بھر میں نگاہِ مردِ مومن سے تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی سے بڑی طاقت کا

غرور خاک میں مل جاتا۔

با تو میگویم ز ایامِ عرب
تا بدانی پختہ و خام عرب

ریز ریز از ضرب او لات و منات
در جہات آزاد از بندِ جہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و قیصریٰ ہلاک از دستِ او

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زور طوفانش بدرد

اندریں دیر کہن پیہم تپید
تا جہانے تازہ آمد پدید

بانگ حق از صبح خیز یہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست

اینکہ شمع لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوئے او آوردہ اند

مگر جب اسی عرب قوم نے اپنے زریں اساسی اصولوں کو پسِ پشت ڈال کر ملوکیت جیسی دیگر خباثتوں کو اپنا لیا، قوم فرقوں، ذاتوں، گروہوں اور طبقوں میں بٹ گئی تو کل کے محکوم ان کے حاکم بن گئے وہ فرنگی راج کی چکا چوند میں کھو کر اسی کے در کے سوالی بن کر رہ گئے۔

حق ترا بُراں تر از شمشیر کرد
ساربان را راکب تقدیر کرد

بانگ تکبیر و صلوٰۃ و حرب و ضرب
اندراں غوغا کشاد شرق و غرب

اے خوشا آں مجذوبی و دل بردگی
آہ زیں دل گیری و افسردگی

امتے بودی امم گر دیدہٗ
بزم خود را خود ز ہم پاشیدہٗ

ہر کہ از بندِ خودی وارست مرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست مرد

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روح پاکِ مصطفیٰؐ آمد بدرد

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد

علامہ عربوں کے سطوت و دبدبے اور جاہ و حشمت کے حسین تصورِ ماضی کی تصویر کھینچتے ہوئے ان کے زوال پذیر حال پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

گفت" اے روحِ عرب بیدار شو
چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو

اے فواد اے فیصل اے ابنِ سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت
در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت

اے جہانِ مومناں مشک فام
از تو می آید مرا بوئے دوام

زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر!
تا کجا تقدیر تو در دستِ غیر؟

بر مقامِ خود نیائی تا بکے!
استخوانم در پے نالد چو نے!

از بلا ترسی حدیثِ مصطفیٰؐ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفا است

وہ عربوں کو دامِ فرنگ کا اسیر ہونے پر مطعون کرتے ہوئے انہیں پیغام حرکت و عمل دیتے ہیں تاکہ ان میں روح انقلاب پیدا ہو۔

قوت از جمعیت دیں مبیں
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

تا ضمیرش راز دانِ فطرت است
مرد صحرا پاسبانِ فطرت است

سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب
از طلوعش صد ہزار انجم غروب

بگذر از دشت و درو کوہ و دمن
خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز
ناقہ را سر دہ بمیدان ستیز

عصرِ حاضر زادۂ ایام تست
مستی او از مے گلفام تست

شارحِ اسرارِ او تو بودۂ
اولیں معمارِ او تو بودہ!

تا بفرزندی گرفت او را فرنگ
شاہدے گردید بے ناموس و ننگ

ملوکیت میں مخصوص افراد کے پیش نظر مفادِ عامہ یا ملکی و قومی مفادات پر گروہی یا خاندانی مفادات مقدم ہوتے ہیں۔ لبنان میں فلسطینی مہاجرین پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ معصوم عرب مہاجرین کے خون سے ہولی کھیلی گئی تو دنیا بھر کا پریس چلا اٹھا ہر حساس دل تڑپ اٹھا۔ مگر عرب ملوکیت کے سائے میں عوام خوابِ غفلت میں بے حس و حرکت تماشائی بنے رہے فلسطینی مردِ مجاہد یاسر عرفات اپنوں کی اس بے حسی پر خون کے آنسو رو رہا تھا مگر عرب شیوخ دشمن ہی کے گھر

بیٹھے زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کا سماجی و معاشی نظام اسی مغربی استعماری نظامِ سیاست کا مرہونِ منت ہے یہی وجہ ہے کہ عرب ملوک قاتل و سفاک سامراج ہی سے انصاف کی بھیک مانگتے رہے۔

انہی عرب فرمانرواؤں کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

"عربوں کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اب وہ ان عرب بادشاہوں پر اعتماد نہیں کر سکتے جو مسئلہ فلسطین کے متعلق ایک آزادانہ اور ایماندارانہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں عربوں کا فیصلہ پورے غور و خوض کے بعد ایک آزادانہ فیصلہ ہونا چاہیئے۔"[1]

عجمی ملوکیت میں اس کی زندہ مثال شاہ ایران رضا شاہ کی امریکہ جیسی استعماری قوت کے ہاتھوں ملک و قوم کی حمیت و غیرت کا وہ سودا ہے جس کے عوض اس نے صرف اور صرف اپنی بادشاہت کے تحفظ کی ضمانت طلب کر رکھی تھی ایک طرف عوام روحانی و مادی بھوک ننگ کے شکار تھے جبکہ دوسری طرف ملکی ذرائع و وسائل، بیدردی سے سامراج کے مفادات کی بھینٹ چڑھائے جاتے تھے عوام مسلم دشمن یہود سے متنفر تھے مگر شاہ نے صیہونی ریاست کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مغربی سامراج عوام کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر شہنشاہ ان کے ساتھ اقتصادی، سیاسی و عسکری معاہدات

---

[1] اقبال اور سیاست ملی از رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۵۶

کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ تحریر و تقریر پر اس قدر سخت پابندی عائد تھی کہ زبان کھولنے والے کی زبان گدی سے نکلوا دی جاتی، اسے طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں بیشتر علماء و فضلا اور سیاستدان جلا وطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ خاندانی اقتدار کی بقاء کے لئے ظالم و سفاک شہنشاہ نے عوام پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے، نہتے اور مظلوم احتجاجی مظاہرین پر گولی تو درکنار ان پر ٹینکوں اور طیاروں سے گولے برسائے گئے۔ ان کے خلاف آتشیں اسلحہ استعمال کیا گیا جس سے ہزاروں بے گناہ انسان راہ حق میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے جام شہادت نوش کر تے رہے بالآخر جب عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو عوامی غیض و غضب کا ایسا طوفان اٹھا کہ ملوکیت کی دھجیاں بکھر گئیں، کل تک سیاہ و سفید کے مالک شہنشاہ کا وجود آج روئے زمین کے لئے ناقابل برداشت بن چکا تھا، وہ دربدر بھٹکتا پھرا لیکن اسے موت تک کہیں بھی چین نصیب نہ ہوا، افغانستان کے شاہ ظاہر شاہ کا انجام اس سے کم عبرتناک نہیں، چنانچہ مذکورہ شاہان کی پالیسیوں اور ان کے انجام کے پیشِ نظر نہ صرف موجودہ عرب ملوکیت کے مستقبل کا تعین باآسانی کیا جا سکتا ہے بلکہ خون مسلم کی ارزانی پر ان کی بے حسی اور قاتل سامراج ہی سے داد و فریاد کی رازداری بھی قابل فہم ہے۔
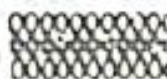
اقبال اور اشتراکیت کا مشترکہ محاذ

چین اور روس جیسی عظیم ریاستیں جس نظریئے کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس کا بانی کارل مارکس تھا جس نے سرمایہ داری نظام میں آنکھ کھولی اور حضرت موسیٰ کی طرح اسی نظام میں پرورش پاتے رہے۔ وہ ۱۸۱۸ء میں جرمن میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۸ء میں ان کی شہرہ آفاق کتاب داس کیپٹیل (سرمایہ) شائع ہوئی جس نے مغربی نظام سیاست میں تہلکہ مچا دیا اس کتاب اور مصنف کے بارے میں اقبال نے کہا:-

"جرمن کا مشہور ماہر اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا اس کی مشہور کتاب موسوم بہ سرمایہ کو مذہب اشتراکیت کی بائبل تصور کرنا چاہیئے۔" [۱]

مغربی اقوام جاگیرداری، ملوکیت اور کلیسا کے ہوسِ اقتدار و استحصال کا شکار تھیں۔ جونہی جاگیرداری سماج سرمایہ داری نظام میں تبدیل ہوا، عوام کو اس سے بہت سی امیدیں بندھیں۔ جدید علوم و فنون کی بدولت اس نے صنعتی انقلاب پیدا کیا۔ انسان کے آرام و آسائش کے لئے نت نئی ایجادات منظرِ عام پر آتی گئیں مگر بنیادی طور پر عوام کے لئے یہ تبدیلی محض حکمرانوں یا آقاؤں کی تبدیلی تھی۔ پہلے غریب کاشتکار پر جاگیردار کی سیادت قائم تھی۔ اب سرمایہ دار مزدوروں کا ناخدا بن بیٹھا۔ پہلے جاگیردار حاکم تھا اب اس

---

[۱] حاشیہ پیام مشرق

کی جگہ سرمایہ دار براجمان تھا، ویوہیکل مشینوں کی بدولت بے شمار مزدور
بیروزگار ہو گئے۔ جو کام بیل سے لیا جاتا تھا اس دور میں وہی کام مزدور
سے لیا جانے لگا۔ وہ مشقت، بھوک وافلاس سے نڈھال تھا مگر روح و
جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اسے شب و روز کارخانے کا ایندھن بننا پڑتا
بیماری کی حالت میں اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا، بلکہ حالت بیماری میں اسے
تندرست انسانوں کے جتھے سے الگ کر کے روزگار سے محروم کر دیا جاتا۔ مزدور
حالت بے بسی میں بے زبان جانوروں کی طرح لقمہ اجل بنتے چلے گئے مگر سرمایہ دار کے
کان پر جوں تک نہ رینگی وہ بدستور خونِ مزدور پر ایوان تعیشات تعمیر کرتا رہا۔

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکردہ کار
عیش کا ہے پتلا محنت ہے اسے ناسازگار

کلیسا کو ریاست سے جدا کر دیا گیا لیکن اس سے بھی عوام کی حالت پر کوئی اثر نہ
پڑا۔ ان میں تعلیم کی بدولت جب سیاسی شعور پیدا ہوا تو مغربی ایوان ہائے اقتدار
کے لئے خطرات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سرمایہ دار نے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے
سلطانی جمہور کا نعرہ بلند کیا۔ الیکشن ممبری و کونسلری کو عوامی اقتدار کا نام دے
دیا گیا جبکہ اس طریق انتخاب کے ذریعے بھوکے، برہنہ تن و لاغر افراد لاکھوں
پاؤنڈ خرچ کر کے دارالامرا تو درکنار دارالعوام تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ تاہم ان
کی حسرت ناتمام کو ووٹ کے جھنجھنے سے بہلانے کی کوشش کی گئی۔

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

الیکشن ممبری کونسل صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے

جہاں بھی عوام نے اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جسارت کی انہیں غدارِ قوم وطن قرار دے کر تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب مسولینی و ہٹلر نے قومی و نسلی تحریکوں کا آغاز کیا تو ملوکیت و کلیسا، سرمایہ دار و زمیندار کے ظلم و جور سے بیزار عوام نے انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے زور شور سے ساتھ دیا مگر افسوس کہ ان تحریکوں نے بھی استعماریت کے جوش میں نظام نوآبادیات کی طرف بڑھنا چاہا تو اسے وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت کے ہاتھوں پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے :۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا یہ حقیقت ہے دل خراش

اسی جوش و خروش کا نتیجہ تھا کہ عوام نے پیرس میں اشتراکی حکومت قائم کر لی جب کہ استعماری قوتوں نے اسے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اس کا خاتمہ کر دیا مگر جلد ہی دنیا کے دوسرے کونے اور اس کے چھٹے حصے سے ایک ایسا طوفان اٹھا جو اپنے جلو میں ملوکیت، کلیسا و جمہوریت کے نظام کہن کو خس و خاشاک کی طرح ساتھ بہا لے گیا۔ اس کے بارے میں اقبال نے کہا:-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئ رفتار
اندیشہ ہوا شوخئ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
یہ وحی دہریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات

اسی انقلاب کے نتیجے میں روسی نظام حیات اشتراکیت کے جدید اصولوں پر استوار کیا گیا۔ طبقاتی نظام ختم کر کے پرولتاریہ کی حکومت قائم کی گئی۔

آں نظام کہنہ را برہم زد است
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

جب یہاں کا نظام حکومت و سیاست کامیابی سے چل نکلا تو دنیا یہ تسلیم

کرنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ نیا تجربہ جدید ترین علم کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ دنیا بھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ملوکیت سرمایہ داری اور مذہبی جنونیوں نے اسے اپنے مفادات اور وجود کے لئے خطرۂ عظیم جانتے ہوئے اس کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر لیا جب وہ توپ و تفنگ سے اسے زیر نہ کر سکے تو ترقی پذیر و مشرقی اقوام کو اس کے سحر سے ڈرانے لگے۔ برطانیہ کے بعد امریکی سامراج نے [illegible] نظام کا آغاز کیا۔ اپنے یورپی و دیگر حلیفوں کو ساتھ ملا کر عالمی سطح پر سرد جنگ کا آغاز کر دیا۔ اشتراکیت کو چھوت کی بیماری سے تشبیہ دی گئی جس کے جراثیم ہمسایہ ممالک خصوصاً مفلس اقوام میں تیزی سے سرایت کر جاتے ہیں چنانچہ اس سرمایہ داری بلاک نے نو آزاد خصوصاً افریشیائی ممالک کو بے پناہ اقتصادی و فوجی امداد دی مگر کمیونزم کے بھوت کا خطرہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اسے قابو میں رکھنے کے لئے [illegible] جیسے حربے آزمائے گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت نے اپنے اس دعوے کو عملاً سچ ثابت کر دیا کہ [illegible] نے ماضی کی جمہوریت و سرمایہ داری کی ادھوری شکل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔

اقبال کی پیشین گوئی کے مطابق زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے مغربی استعمار، نظام اور مغربی مفکرین کو تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ امریکہ کے سابق [illegible] خسارہ [illegible] کو حقیقت دار [illegible] رسالے نیوز ویک

میں اس نظام کی تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مغربی ممالک کے جمہوری نظام اقتصادی بدحالی کے باعث تباہ ہونے والے ہیں اگرچہ ماضی میں ان ممالک میں آزاد خیال پارٹیوں کو شکست ہوئی اور وقتی طور پر قدامت پسند پارٹیاں جیت گئیں لیکن بالآخر سوشلسٹوں نے فتح حاصل کرلی۔ اس کا ثبوت فرانس، چین، یونان اور سویڈن سے مل سکتا ہے۔ یہ آزاد سرمایہ کاری کی پالیسیوں کا شاخسانہ ہے کہ آج ترقی یافتہ ممالک میں، تین کروڑ لوگ بیروزگار ہیں اور ابھی بیروزگاری بڑھ رہی ہے اور ترقی کی امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ ان مغربی ممالک میں سماجی بھلائی کی فلاحی ریاست تو ترقی کرتی گئی لیکن پیداوار پر زوال آتا گیا۔" آخر میں مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مغربی ممالک کی صنعت کو جو مقابلہ درپیش ہے، وہ ان کا گلا کاٹ رہا ہے، اس لئے اب آزاد تجارت و سرمایہ کاری کے اصول کو خیرباد کہہ کر امریکہ کو دیگر مغربی ممالک کے ساتھ مل کر امداد باہمی کی بنیاد پر ایسی سرمایہ کاری کرنی چاہیے جس میں ترقی پذیر (مشرقی) ممالک بھی شامل ہوں۔[1]

روسی اشتراکیت سے مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق بھی متاثر ہوا چنانچہ علامہ اقبال جیسے انقلاب پسند مفکرین نے اس پر اپنے اپنے ردعمل کا اظہار کیا خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں آپ نے افیونی روحانیت اور سوشلزم کے بارے میں علماء کی سوچ اور شور و غوغے سے قطع نظر لکھا کہ۔

---

[1] نیوز ویک ۸ جنوری ۱۹۸۳ء

روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

اقبال طبعاً انقلاب پسند ہونے کے علاوہ مغربی استعمار سے سخت متنفر تھے۔ چنانچہ کلیسا، سرمایہ داری اور ملوکیت کا تختہ الٹنے والے مردِ مومن لینن سے وہ بہت خوش تھے، جہاں انہوں نے اس کی تعریف و توصیف کی وہاں یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام جس کے ہم دعویدار ہیں بذات خود ایک سوشلزم ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم بھی وہی ہے جو سوشلزم کی وہ کسی بھی قوم خصوصاً مسلمانوں کی اقتصادی مساوات اور خود کفالت پر اتنا ہی زور دیتے ہیں جتنا کہ اشتراکیت وہ کہتے ہیں۔" روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو کی ساہوکاری و سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے۔" [1]

علامہ معاشی آزادی کو سیاسی آزادی پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔ ہمارے اہل الرائے سیاسی آزادی سیاسی آزادی پکارتے ہیں مگر کوئی اس باریک نقطے کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ کہ سیاسی آزادی کی شرائط میں سب سے پہلی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ

---

[1] خط بنام قائد اعظم ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

میں سبقت لے جانا ہے"[1]

اقبال کے نزدیک مفلسی ایسی لعنت ہے، جس میں مبتلا ہو کر انسان انسان ہی نہیں رہتا۔ ان کا کہنا ہے کہ "غریبی اور افلاس بہت بڑی لعنت ہے، جس میں مبتلا ہو کر انسان انسان نہیں رہتا"۔[2]

اشتراکیت کا مقصد انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور محنت کی عظمت ہے۔ اس نظام میں دوسروں کی محنت پر پلنے والے طبقے کا کوئی تصور نہیں، جبکہ اقبال کا کہنا ہے:۔

حکم حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

اقبال نے سرمایہ دار، جاگیر دار، کلیسا و ملوکیت کے خلاف مزدور و عظمتِ محنت کے حق میں مختلف اشتراکی مصلح و مفکرین کے نظریات انہی کے حوالے سے جا بجا اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں۔ کارل مارکس کا کہنا ہے کہ جزو و کل کا راز داں انسان نہ صرف خود سے بے خبر و غافل ہے۔ بلکہ سرمایہ داری کے ہاتھوں انسان کا قاتل ہو رہا ہے:۔

راز دانِ جزو و کل از خویش نا محرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

---

[1] انوارِ اقبال از بشیر احمد ڈار ص ۲۶ [2] حیاتِ اقبال کا جذباتی دور ص ۲۱۴

مشہور فرانسیسی فلسفی کومٹ مردِ مزدور کو سمجھاتا ہے کہ اس دنیا میں تو ایک حکم دینے والا اور دوسرا حکم بجانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ محمود ایاز کے فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتا۔ زندگی تو تقسیم کار ہی کی بدولت سراپا چمن ہے

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
ہماں نخل را شاخ و برگ و برا ند

دماغ از خرد زاست از فطرت است
اگر پا زمیں ساست از فطرت است

یکے کار فرما، یکے کارِ ساز
نیاید ز محمودِ کارِ ایاز!

نہ بینی کہ از قسمتِ کارِ زیست
سراپا چمن می شود خارِ زیست

اس کے جواب میں مردِ مزدور کہتا ہے کہ اے فلسفی تو مجھے اس فلسفہ سے دھوکہ دے رہا ہے کہ بندہ و آقا کا پرانا تعلق توڑا نہیں جا سکتا۔ سرمایہ دار کی حقیقت کیا ہے۔ یہ تو زمین کے کاندھے پر ایک بوجھ ہے اسے کھانے اور سونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ دنیا کی حقیقی رونق اور ترقی مزدور ہی کے دم سے ہے۔ تو یہ نہ سمجھ کر کہ سرمایہ دار کی طرح کوئی ڈاکو بھی یہ فرض ادا کر سکتا ہے۔

عقل و فہم کے باوجود تجھ پر جھوٹ کا جادو چل گیا ہے تو حکیم ہونے کے باوجود دھوکہ کھا گیا ہے اس لئے تو سرمایہ دار کے جرم و تعدی کے عذر لے

کر آیا ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے حکیم
کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم
مسِ خام را از زر اندودہٗ؟
مرا خوئے تسلیم فرمودہٗ؟

کمند بجبر را آبنا یم اسیر
زخارا بروتیشہ ام جوئے شیر
حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج
بہ پرویز پرکار نابردہ رنج؟

خطا را بحکمت مگرداں صواب
خضر را نہ گیری بدام سراب
بدوشِ زمیں بار، سرمایہ دار
ندارد گذشت از خور و خواب کار

جہاں راست بہروزی از دستِ فرد
ندانی کہ ایں ہیچ کار است دُزد
پئے جرم او پوزش آوردہٗ؟
بایں عقل و دانش خوردہٗ؟

اشتراکیت نے مذہب کو برگِ حشیش کہا تو اقبال نے بھی خواجگی کو مسکرات کا نام دیا ہے وہ "خضرِ راہ" میں تلخ لہجے میں مزدور کے استحصال کی

مذمت کرتے ہوئے اسے پیغام آزادی دیتے ہیں:۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

نسل قومیت کلیسا، سلطنت، تہذیب رنگ

خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کلیسا سے تصادم میں مغرب کی طبعی سائنس وعلوم و فلسفہ کی کامیابی سے عوام وخواص کی اکثریت مذہب سے دور مادہ پرستی کے سائے میں پناہ لے چکی تھی۔ اشتراکیت اسی مادیت کی ترقی یافتہ شکل تھی جس نے مذہب کو ایسی افیون قرار دیا۔ جس کے خزانے مسجد و مندر، چرچ و گردوارے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ مذہب ہے جس نے ایک طرف خوشامدی و فتویٰ فروش علماء سُو پیدا کئے تو دوسری طرف ملوکیت کے حاشیہ بردار و سرمایہ داری اور جاگیرداری کے محافظ مسیحی پیشواؤں کو جنم دیا۔ جنہوں نے سادہ لوح کاشتکار و مزدور کو حقوق طلب کرنے پر صبر کی تلقین کی اور کہا

ان اللہ مع الصابرین

اسی طرح کی دورنگی اور منافق عقل کے فلسفۂ خود پرستی و خود کامی کے بارے میں ٹالسٹائی کہتا ہے۔

عقل دو اُو آفرید فلسفۂ خود پرست

درس رضامی دہد بندۂ مزدور را

سرمایہ دار و مزدور کے مابین ایک مکالمہ بعنوان "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور"، میں سرمایہ دار کی استحصالی ذہنیت میں عبادت گاہوں اور آخرت کی جو حیثیت ہے، اسے واضح کیا گیا ہے۔ شاطر و چالاک سرمایہ دار سادہ لوح مزدور سے مخاطب ہے کہ یہ تمام دنیاوی بکھیڑے اور معاملات میری دردسر ہیں۔ جبکہ مذہبی عبادت گاہوں کا سرور اور آخرت کی ابدی زندگی کی نعمت بہشت تیرے لئے ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن

گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو!

نخلے کہ شہ خراج بر ومی نہد زمن

باغ بہشت وسدرہ وطوبا ازانِ تو!

تلخابہ کہ دردِ سر آرد آزانِ من

صہبائے پاکِ آدم وحوا ازانِ تو!

مرغابی و تدرو و کبوتر ازانِ من

ظلِ ہُما و شہپرِ عنقا ازانِ تو!

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلا از آنِ تو!

اس کے ساتھ ہی "نوائے مزدور" میں مزدور جونک کی طرح اس کا خون پینے والے مذہبی پیشواؤں و حکومت کی طاقت کا راز فاش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ٹاٹ پہننے والے مزدور ہی کی سعی سے نکھٹو سرمایہ دار ریشمی لباس زیبِ تن کرتا ہے۔ میرے خون پسینہ سے اس کی انگشتری کا لعل تیار ہوتا ہے۔ میرے بچوں کے آنسوؤں سے امیر کے زیورِ اسپ کا موتی بنتا ہے۔ آ اب کہنہ و فرسودہ میکدوں کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں ان ڈاکوؤں سے خونِ لالہ کا انتقام لیں۔ اور محفلِ غنچہ و گل ریاست کی بنیاد کسی نئے انداز پر رکھیں اے پروردگار تیری دنیا چند ذلیل لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کے معقول و برگزیدہ لوگ نا اہلوں سے وابستہ ہو رہے ہیں۔

زمزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
زخوئے فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی
زاشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
زخونِ من چو زلو فربہیٔ کلیسا را
بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں زگریہ سحرم
شباب لالہ و گل از طراوتِ جگرم

بیا کہ تازہ نوامی تراود از رگِ ساز
مے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم

مغان و دلیر مغاں را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

بہ طوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

جہانِ تست در دست خسے چند
کسان او بہ بند ناکسے چند

زمین کی ملکیت کے مسئلے پر بھی اقبال اور اشتراکیت میں مطابقت رائے پائی جاتی ہے۔ اشتراکیت زمین کو اشیائے پیداوار کی حیثیت سے فردِ واحد یا خاندان کی بجائے مجموعی طور پر معاشرے کی ملکیت قرار دیتی ہے جبکہ اقبال کا کہنا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہا نے زمین کے مسئلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بہ تحقیق مطالعہ کیا جائے پھر ماہرینِ فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلے پر غور کریں۔ زمین کی بہر حال یہ حیثیت نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے صرف کی طرح افراد کا حق ملکیت

تسلیم کریں ؎۱"

پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقین

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیر زمیں ہے دھرتی کا مال ہے

اس مسئلے پر اسلام کا نقطۂ نظر قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا ہے کہ

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

خدا اور زمینی پھل کے اس رشتے پر اقبال الارض للہ میں کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ! کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟
دہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں !
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں !

جاوید نامہ کی ایک نظم " ارضِ ملک خداست " میں کہتے ہیں ۔

؎۱ اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی ص ۲۹

حاصلِ آئین وہ دستورِ ملوک ؟
دِہ خدایاں فربہ وہ دہقاں چو دوک

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب ،

یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ
آں نگوں گر بے ہمہ ہم باہمہ

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است
نے ازانِ تو نہ ازانِ من است

درنسازد با تو ایں سنگ و حجر
ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر

اختلاطِ خفتہ و بیدار چیست ؟
ثابتے را کار با سیار چیست ؟

حق زمیں را جز متاعِ ، ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا ! نکتہ از من
رزق وہ گور از وے بگیر او را مگیر

صحبتش تا کے تو بود و او نبود
تو وجود و او نمودِ بے وجود

تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطِنُ الاَرضُ لِلّٰہ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

خطاب بہ ملتِ روسیہ میں اقبال اہلِ روس سے مخاطب ہو کر جہاں انقلابِ روس ۱۹۱۷ء کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہاں انہیں اس نئی شریعت، نئے دین و نئی فکر کو اسلامی تعلیمات سے روشن کرنے اور فرنگ سے محترز ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ مزدور کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے اور انہیں مغربی استعمار کی استحصالی حکمت سے باخبر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے کہ می خواہی نظام عالمے
جستہ او احساس محکمے؟

در ستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب

با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟
مژدۂ "لاقیصر و کسریٰ" کہ داد؟

درگذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

گر ز مکر غربیاں باشی خبیر
روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر

چیست روباہی؟ تلاشِ ساز و برگ
شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ!

رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است

بندۂ مومن امیں، مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

رایت حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودہ آدم کنفسٍ واحدہ

اندرو تقدیر ہائے شرق و غرب
سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

آفریدی شرح و آئینے دگر
اندکے با نورِ قرآنش نگر

از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

گر تو باشی صاحبِ شے می سزد
ور نباشی، خود بگو کے می سزد؟

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ !!

زیرِ گردوں فقر و مسکین چراست ؟
آنچہ مولاست، می گوئی ز ماست

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروئے دخترِ مزدور برد

در حضورش بندۂ می نالد چو نے
بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے

بے بجامش بادہ و نے در سبوست
کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

امتے بر امتِ دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

شیوۂ تہذیب نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود !

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

کارل مارکس کی طرح اقبال بھی نئے جہاں کا خواہشمند ہے کارل مارکس کی صدا ہے ۔

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

تیری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش !

جہانِ مغرب کی بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقلِ عیار کی نمائش

اس جہانِ نو کے بارے میں اقبال مارکس سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے اشتراکی اصولوں کے ساتھ ساتھ روحانی طاقت کو بھی جاری و ساری کرنا چاہتا ہے ۔ اشتراکیت میں خدا، آخرت اور مذہب کا تصور عوام کو سلانے اور لوٹنے کے لئے ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہب کا حیلہ اور نغمۂ سرور ہے ۔ جبکہ اقبال کے نزدیک تصورِ آخرت نہ صرف

انسانوں کو دنیاوی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا یقین ہے کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے۔ جو ابدی ہے اور جہاں انسان اور اس کے اعمال و افعال کی جزا و سزا ملے گی۔ چنانچہ اقبال کا کہنا ہے کہ اگر یہ دونوں نظریات آپس میں مل جائیں تو ان کا یہ نیا نظام دنیا کی ناقابل فانی و ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے گا۔ ان کا کہنا ہے۔

اے ملت روسیہ! تم نے ہمت کر کے اسلام کے ایک حصے کو آئین حیات بنایا ہے۔ اگر تم باقی ماندہ حصے کو بھی اپنا لو تو اس فرسودہ ملت کی جگہ لے لو گے [1]

اس نئی دنیا یا نظام میں اشتراکی اصولوں کو نظام اسلام سے ہم آہنگ کر کے اپنایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے قائداعظم کے نام ایک خط میں اس کا طریق کار بتایا ہے۔ "میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں سوشلزم کا مقدر رہی ہے۔ جو بدھ مت کا مقدر تھا۔ لیکن اتنی بات میرے ذہن میں صاف ہے۔ کہ اگر ہندو مت اشتراکی جمہوریت کو قبول کرتا ہے تو پھر یہ ہندو مت نہیں رہتا البتہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اسلامی اشتراکیت کی کسی ایسی صورت کو قبول کرنا جو اسلام کے قانونی اصولوں سے ہم آہنگ ہو کوئی انقلاب نہ ہوگا بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی جانب لوٹنے کے مترادف ہوگا۔" [2]

۳۰ جولائی ۱۹۳۰ء میں لاہور کے ایک مقبول انگریزی روزنامے میں

---

[1] فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم صفحہ ۲۶۸

شائع ہونے والے ایک مضمون میں انہوں نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ "اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر لیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آجاتا ہے۔ اس لئے میں متعجب نہ ہوں گا۔ اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر"۔

اقبال کا تصورِ جمعیت اقوامِ مشرق

پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر ولسن کے ایما پر ۱۲۷ اقوام نے مل کر معاہدہ ورسیلز کی رو سے جون ۱۹۱۹ء میں جمعیت الاقوام قائم کی جس کا مستقل صدر دفتر سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں قائم کیا گیا۔ ان کی اس جمعیت کا مقصد استعمار و ملوکیت کے نمرودی انداز کی بحالی اور برقراری میں بین الاقوامی استحکام پیدا کرنا تھا۔ جمعیت الاقوام جنگ عظیم کی بربادیوں سے تباہ حال ایسی استعماری قوتوں کے مابین ایک سمجھوتے کا نتیجہ تھی۔ جن طاقتوں کا محرک وہی حکمت افرنگ تھی جس کا مقصود Divide & Rule رہا ہے۔ یہ اسی یورپی سامراج کی سوچ کا حاصل تھا جس نے ملکی، نسلی، لسانی، رہائشی و گروہی بنیادوں پر تصور قومیت دیا۔

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

اس کے برعکس چودہ سو سال قبل مکہ نے جو تصورِ ملت دیا، اس کی بنیاد نہ تو رنگ، ملک، نسل، امارت و غربت اور نہ ہی عربی و عجمی کی تفریق پر تھی۔ مشرق و مغرب پر اس کی حکمرانی تھی جس میں افریقہ کے سیاہ فام حبشی سفید فام یورپی اور گندمی رنگت کے حامل عجمی کے علاوہ عربی، برمی، فارسی، عبرانی گجراتی، چینی و انگریزی تمام زبانوں کے لوگ شامل تھے۔ نیل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، ایک ہی ملت، ایک ہی قوم، جمعیتِ آدم کا تصور تھا۔ اقبال اسی

تصور کے تحت مکہ و جینوا کا مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم !
تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم !
مکّے نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم ؟

ملوکیت افرنگ کے اس جمعیت الاقوام کے پسِ پشت محکوم مشرقی اقوام کے استحصال ہی کا جذبہ کارفرما تھا جن پر مختلف یورپی اقوام غالب و حکمران تھیں۔ چنانچہ ایسی جمعیت کے وجود میں آتے ہی اقبال نے اس کے بارے میں کہا۔

برفتد تا روشِ ازم دریں بزم کہن
دردمندان جہاں طرز نو انداختہ اند !
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند !
بادِ صبا اگر بہ جینوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوی و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

زندگانی ہر زماں در کشمکش
عبرت آموز است اصول حبش

شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال
برہ را کرد است بر گرگاں حلال!

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد
از کفنِ دزداں چہ امید کشاد

در جنیوا چیست غیر از مکر و فن
صید تو ایں میش و آں نخچیرِ من!

نکتہ ہا کو می نہ گنجد در سخن
یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

علامہ اقبال کی دوربین نگاہوں نے استعماری قوتوں کے ایسے اڈوں کے بارے میں جو پیشین گوئی کی وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی تاہم ان کا طنزیہ انداز قابلِ غور ہے۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد میرے منہ سے نہ نکل جائے

تقدیر تو مُبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

تاریخِ مشرق میں ایران کو جو اہمیت حاصل تھی اس کے پیشِ نظر علامہ نے کہا کہ کچھ بعید نہیں جو نگاہ فلکِ پیر بدل جائے۔ ملوکیت افرنگ نے جمعیتِ اقوام کی آڑ میں جو خواب دیکھا ہے، ممکن ہے اس کی تعبیر بدل جائے اور جینوا میں قائم ہونے والی جمعیت کے مقابلے میں مظلوم و مقہور مشرقی اقوام تہران میں جمعیت الاقوام مشرق قائم کر کے کرۂ ارض کی تقدیر بدل ڈالیں؛

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے:

دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

یورپی استعمار سے مشرقی اقوام کی آزادی، شرقی و غربی اور شمالی و جنوبی آویزش، تنظیم اسلامی کانفرنس، ملوکیت سے نفرت کے نتیجے میں حالیہ انقلابِ ایران اور دنیا میں غیر جانبدار تحریک کا عروج اقبال کے اسی تصورِ جمعیت اقوامِ مشرق کی تعبیر ہے۔ یہی اقوام مزید اتحاد و ارتباط کے ذریعے ہر جدید و قدیم سامراج کا بستر گول کر سکتی ہیں۔ اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ تمام مشرقی یا ترقی پذیر ممالک اپنے ملکی و علاقائی اختلافات مٹا کر مختلف علاقائی و گروہی تنظیموں کو مدغم کر کے مغرب کے مقابلے میں متحد و منضبط ہو جائیں تاکہ خام مال (خام تیل، زرعی اجناس

(معدنی اشیاء) کی معقول قیمتیں وصول کر سکیں۔ وہ اپنے ذرائع ابلاغ میں اس طرح سے ہم آہنگی پیدا کر لیں کہ یہاں کے عوام مغرب کے مکمل پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دے سکیں۔ نتیجتاً ان کے اندرونی سیاسی و سماجی نظام اس طرح سے مستحکم ہوں کہ مغربی ممالک کی طرف سے جمہوریت کی آڑ میں قومی مفادات کی خاطر کی جانے والی مداخلت بے اثر ہو۔ ان سب اقدامات کی بدولت مشرقی ممالک اقتصادی وسائل مجتمع کرنے کے ساتھ ساتھ طبعی، تجرباتی سائنس و عسکری قوت میں اضافے کی طرف متوجہ ہوں تو وہ دن وہ صبح تو دور نہیں جس کی پیشین گوئی حکیم الامت، مفکرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت نے بہت پہلے کر دی تھی۔

گفت ہنگام طلوع خاور است
آفتابِ تازہ او را در بر است

لعل ہا از سنگ رہ آید بروں
یوسفانِ او ز چہ آید بروں

رستخیزے در کنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام

رخت بندد از مقام آزری
تا شود خوگر ز ترکِ بت گری!

اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید
از گِل خود خویش را باز آفرید

عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے!"

ارضِ فلسطین اور اقبال

۱۹۱۷ء میں صیہونی تحریک کے صدر ویزمین نے برطانوی سیاستدان آرتھر جیمس بالفور کو یقین دلایا کہ انہیں ان کے حلقہ مانچسٹر یونیورسٹی سے جہاں یہودی ووٹ کافی بااثر تھے یقینی طور پر کامیاب کرایا جائے گا علاوہ ازیں جنگ عظیم اول میں یہودیوں نے برطانوی سامراج کی بھرپور مدد کی اور برطانیہ کو یقین دلایا کہ اسرائیل کے قیام سے اس کے لئے ہندوستان کا راستہ محفوظ ہو جائے گا۔ چنانچہ یہود و فرنگ کے درمیان ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک معاہدہ (اعلان بالفور) طے پایا۔ جس میں برطانیہ نے یہودیوں سے ارض فلسطین میں اسرائیل کے قیام کا وعدہ کیا۔ اور جب اس معاہدے پر عملدرآمد کیا جانے لگا تو دنیا کی تمام انصاف پسند اقوام نے اس کھلی دھاندلی اور مسلم دشمنی کے خلاف پرزور آواز بلند کی۔ اقبال نے اس کھلی دھاندلی اور مسلم دشمنی کے خلاف پرجوش اور ولولہ انگیز تقاریر کیں۔ انہوں نے تقسیم فلسطین کے لئے برطانوی رائل کمشن کی رپورٹ کے جواب میں فرنگی سامراج کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔

"یہ فیصلہ مسلمانان عالم کو ایک موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاستدان تلاش کر رہے ہیں، محض قضیۂ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا

مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں یہود کا ۱۳ صدیوں پہلے حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا۔ فلسطین سے یہودیوں کا زبردستی اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا۔ بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا بالفرض اگر یہ اعتراف بھی کر لیا جائے کہ حروب صلیبیہ نے فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کی کوشش کی تھی تو اس کوشش کو صلاح الدین کی کوششوں نے ناکام بنا دیا۔ لہٰذا میں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہوں۔

مشرق قریب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے کبھی بھی اس طرح بے نقاب نہیں ہوئے تھے جیسے رائل کمیشن کی رپورٹ نے انہیں رسوا کر دیا ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انقلاب اور سیاست کی شکل میں اپنے ایک مقام کی متلاشی ہے۔ یہ رپورٹ مسلمانان ایشیاء کے لئے بڑی بڑی عبرتوں کی سرمایہ دار ہے۔ تجربہ نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں و ترکوں کے فوری اتحاد پر موقوف ہے۔ ترکوں کو دنیائے اسلام سے علیحدہ کر دینے کی حکمت عملی ابھی تک جاری ہے۔ رگا ہے گاہے۔ اب بھی یہ صدا بلند ہوتی ہے کہ ترک تارک

اسلام ہو رہے ہیں۔ ترکوں پر اس سے بڑا الزام نہیں باندھا جا سکتا اس شرارت آمیز پراپیگنڈے کا شکار وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو تاریخ تصورات اسلامیہ سے نابلد ہیں۔ فلسطین انگلستان کی کوئی ذاتی جائیداد نہیں۔ فلسطین تو انگلستان کے پاس جمعیتہ الاقوام کی طرف سے زیر انتداب ہے۔ اور مسلم ایشیاء لیگ آف نیشنز کو انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ایک ادارہ سمجھتا ہے جسے انہوں نے کمزور مسلم سلطنتوں کے علاقوں کی تقسیم کے لئے وضع کر رکھا ہے۔ فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے تو اس ملک کو رضاکارانہ طور پر عربوں کے قبضہ سے بہت پہلے خیر باد کہہ دیا تھا۔ صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ علاوہ اس امر کے کہ مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔

فلسطینی رپورٹ کو منصفانہ نظر سے پڑھنے والے کے دل میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ تحریک صیہونیت کا آغاز یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن مہیا کرنے سے کہیں زیادہ برطانوی سامراج کے لئے میڈیٹرنیین (بحیرہ روم) میں ایک ساحلی کنارہ حاصل کرنے کے لئے ہوا تھا۔" ایک اور مقام پر آپ نے کہا۔

پارلیمنٹ کے ایک ممبر کے قول کے مطابق یہ ایک خطرناک تجربہ ہے اور اس سے برطانیہ کے لئے بحیرہ روم کا حل میسر نہیں آتا۔ برطانوی مشکلات کو حل کرنے کی بجائے یہ تو برطانوی امپیریلیزم کے لئے آنے والی مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔ ارض مقدس (جس میں مسجد عمر بھی شامل ہے) کی فروخت برطانوی

سیاست کا کارنامہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے تدبر کا ماتم ہے۔ یہودیوں کے لئے زرخیز زمین اور عربوں کے لئے کچھ نقدی اور بے توقیری اور بنجر زمین کی پیش کش کوئی سیاسی دانائی نہیں بلکہ ایک نہایت ہی گھٹیا سودا ہے جو اس نامور قوم کے لئے باعث ندامت جس نے عربوں سے آزادی اور اتحاد کے قطعی وعدے کئے تھے[۱]"

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا!

مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا!

لبنان میں شطیلہ و صابرہ کے مہاجر کیمپوں اور مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں بے بسی و لاچارگی کی حالت میں سسکتی ہوئی انسانیت پر ڈھائے جانے والے لرزہ خیز اور غیر انسانی یہودی مظالم اسی یہود و فرنگ گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہیں۔ فلسطینی عرب کو جس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

---

[۱] اقبال اور سیاستِ ملی از رئیس احمد جعفری ص ۱۲۵

تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے!

عالمگیر اخوت ومساوات کا پیغام

دو عالمی جنگوں کے بعد آج پھر دنیا سرخ و سفید سامراج کے استعماری جنون کا شکار ہے۔ السلواڈور، نکاراگوا، چاڈ، نمبیبیا، لبنان، فلسطین کمپوچیا اور افغانستان غرضیکہ دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک میں سی آئی اے اور کے جی بی اپنے اپنے قومی مفادات کے حصول کے لئے مفسدانہ سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں دو بڑی استعماری قوتوں (امریکہ و روس) کے درمیان جو سرد جنگ جاری تھی۔ اس نے اپنے اپنے حلقۂ اختیار میں فریق مخالف کو پچھاڑنے کے لئے چھوٹے اتحادیوں کے ذریعے مسلح جنگوں کا آغاز کر دیا ہے۔ قوم پرستی مذہبی، جنون سیاسی واقتصادی غلبے کے جذبے نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ آج مسلمان مسلمان سے اور کمیونسٹ کمیونسٹ سے برسرپیکار ہے۔ اسی نیشنلزم کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہوئے علامہ نے کہا تھا

"قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصور نے چھوٹے چھوٹے پولیٹیکل حلقے قائم کرکے اور ان میں رقابت کے اس

صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر جس تمدنِ جدیدہ کی شاخ میں پیوند لگایا ہے، دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہے کہ اس میں غلو اورافراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولیٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔"[۱]

دنیا بھر کی بگ پاورز، مڈل پاورز سمال پاورز حتیٰ کہ غیر جانبدار تحریک کے ممالک بھی بڑی طاقتوں کے حلقۂ اثر کے اسیر ہیں۔ اگرچہ کچھ وجوہات کی بنا پر کچھ مرحلے کے لئے دنیا میں کثیرالاقوت Multipolar سسٹم در آیا تھا۔ مگر آج اس نظام کی خصوصیات اپنانے کے باوجود دنیا دو بلاک Bipolar نظام میں منقسم ہے۔ دونوں سپر پاورز یا استعماری طاقتیں اور ان کے اتحادی ممالک تیسری عالمی جنگ کی امکانی صورت سے نمٹنے کے لئے جہاں تہلک اور آتشیں اسلحے کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ وہاں وہ اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کی وسعت کے لئے نیز جنگ کے دوران استعمال ہونے والے ایندھن (تیل) کے پیداواری خطوں تک رسائی کے لئے جارحیت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اگر ایک طرف امریکہ کینیا، اومان صومالیہ سوڈان مصر،

---

[۱] اقبال کے ملی افکار از محمود عاصم ص ۱۸۲

اسرائیل میں اڈے حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے
تو دوسری طرف روس بھی اتحادی عرب ممالک کے
علاوہ نزدیک ترین و ہمسایہ ملک کے راستے مشرق وسطیٰ
تک رسائی کے لئے عملی اقدامات کر رہا ہے یورپ دوسری
جنگِ عظیم کے بعد ہی سے دو بلاکوں مغربی و مشرقی یورپ
میں منقسم ہے اور اس وقت وہاں سپر پاور کے مابین آئی
بی ایم میزائلوں و تارپیڈو جیسے مہلک ہتھیاروں کی تنصیب
اور ان میں توازن کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

کہیں انسانیت ملکی آمریت و جبر و استبداد کے ہاتھوں نشانہ
ستم بن رہی ہے تو کہیں غیر ملکی حملے اور مداخلت کے باعث
انسانی ہلاکت کا سلسلہ وسیع ہو چکا ہے ترقی پذیر ممالک کی
حکومتوں میں عدم استحکام اور غیر ملکی اثر و نفوذ کے باعث
غیر یقینی کی صورتحال کے پیش نظر وہاں کی معیشت ترقی کی بجائے
تنزل اور استعماری قوتوں کے استحصال کا شکار رہے۔
چنانچہ آج تیسری دنیا خصوصاً افریقہ میں ہزاروں انسان
فاقہ زدگی کے باعث موت کے عفریت کا شکار ہیں۔ انسانی
گروہوں کی مذکورہ باہمی چپقلش و حرص و ہوس کے باعث
انسانیت سسک رہی ہے۔ کہیں فرقہ واریت اور کہیں
اقتصادیات کی جنگ ہے۔ کہیں اقتدار کی جنگ ہے تو کہیں

گروہی مفادات کی جنگ یا کستان کمپوچیا لبنان، سری لنکا، چاڈ، اور خلیج کی جنگ میں بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے یہاں مختلف فرقے باہم دست و گریبان ہوتے ہوئے مخاصمت کی فصیلوں کو انسانی خون سے فلک بوس کرتے جا رہے ہیں۔ نوعِ انسان کو عالمگیر اخوت، مساوات اور وحدت کا پیغام دیتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

"دور حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے آج زمان و مکان کی پنہائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خونریزی، سفاکی اور زیر دست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم

کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی و عملی سطح کو بلند کریں
انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں
مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے
کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین
کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر
تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب
ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب اور ان کے اموال
پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان
بدبختوں کو خون ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا۔
تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش رہیں اور استعمار
کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔

جو سال گذر چکا ہے اس کو دیکھو اور نوروز کی خوشیوں
کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم
ہوگا کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین
ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین ایک قیامت برپا
ہے۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ
اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات
سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا
جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس

تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں ۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں یوم حشر آن پہنچا ہے ہر شخص نفسی نفسی کہہ رہا ہے اور کسی دوسرے کے لئے محبت اور ہمدردی کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ۔

تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کے جان و مال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دے درحقیقت انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں ۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی ۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل ، ایک زبان ، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں ۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت

ہے، جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہیں جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔[۱]

۱۔ ریڈیو سے ایک نشری تقریر یکم جنوری ۱۹۴۸ء

مصنّف کی زیرِ تصنیف کتاب جس میں

طلبائے سیاسیات کے علاوہ سیاست سے دلچسپی

رکھنے والوں کے لئے انمول اور تحقیقی مواد پیش

کیا گیا ہے۔ مصنف: محمّد گلزار راحت